حمید شیخ

گینڈا پہلوان

گینڈا پہلوان

حمید شیخ

گینڈا پہلوان

حمید شیخ

گینڈا پہلوان

(ناول)

پہلی اشاعت: 1961

دوسری اشاعت: 2013

تیسری اشاعت: 2021

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

فون: 35650623 (21-92)

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

cpkarachi2020@gmail.com

ویب سائٹ: www.citypressbooks.com

حمید شیخ (پورا نام عبدالحمید شیخ) سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، کے ایڈیٹر رہے لیکن لاہور کے بارے میں اپنے ہفتہ وار کالم کی بدولت زیادہ معروف ہیں جو وہ پاکستان ٹائمز کے لیے کئی برس، 28 مئی 1971 کو وفات پانے تک لکھتے رہے۔ اسی شہر سے تعلق رکھنے والے دو اور کالم نگاروں، ظفر اقبال مرزا (قلمی نام "لاہوری") اور صفدر میر (قلمی نام "زینو")، کی نظر میں لاہور شہر کے کردار اور اس میں بسنے والے کرداروں کے بارے میں اتنی گہری واقفیت، ہمدردی اور زندہ دلی کے ساتھ کسی اور نے نہیں لکھا۔

اردو فکشن کے میدان میں حمید شیخ کی قصہ گوئی کی زبردست صلاحیت کا اظہار صرف اس ایک مختصر ناول گینڈا پہلوان کی صورت میں ہوا جسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ مصنف کے پیش لفظ اور فیض احمد فیض کے تعارف سے معلوم ہوگا، گینڈا پہلوان ناولوں کے ایک سلسلے کا پہلا حصہ تھا جسے لکھنے کا حمید شیخ نے منصوبہ بنایا تھا اور جس کا مجموعی عنوان جلوس طے کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس سلسلے کا اگلا کوئی ناول نہ لکھا جا سکا۔ یہ ناول بھی 1961 میں شائع ہونے کے بعد تقریباً مکمل طور پر نظرانداز ہو گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چھپنا تو درکنار، اس کا نام تک اردو فکشن کے کسی ذکر میں نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم پڑھنے والے اس کے وجود سے واقف ہیں۔ اپنے قصے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے گردوپیش کے پُرمزاح بیان میں حمید شیخ نے اتنی فنکارانہ خلاقی سے کام لیا ہے کہ اس میں ایک علامتی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں اس قسم کے تخلیقی تجربوں کو مناسب توجہ اور پذیرائی حاصل ہوتی تو اردو فکشن شاید آگے چل کر سپاٹ اور اکتا دینے والی 'حقیقت نگاری' اور بے جان اور مضحکہ خیز 'علامت نگاری' کے رجحانات سے بچ سکتا تھا جنھوں نے ایک عرصے تک اس کی راہ کھوٹی کی۔

پیش لفظ

گینڈا پہلوان ایک لمبے ناول کا پہلا حصہ ہے اور پورے ناول کا نام میں نے جلوس رکھا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پورا جلوس ایک ہی جلد میں چھپواؤں، مگر بوجوہ یہ ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گینڈا پہلوان بذاتِ خود مکمل چیز نہیں۔

بہرحال، فیض صاحب کا تعارفی نوٹ صرف گینڈا پہلوان کے متعلق ہے، گو انھوں نے جو کہا ہے وہ شاید پورے جلوس پر بھی عائد ہو سکتا ہے۔ اس تعارف کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔ سرورق کی تصویر بنانے کا احسان پروفیسر شاکر علی نے کیا ہے اور میں یہ احسان مانتا ہوں۔

حمید شیخ

تعارف

شیخ حمید صاحب کا جلوس واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ یوں تو شیخ حمید صاحب اسے جلوس: ایک ناول کہتے ہیں، لیکن مجھے شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے جلوس کو ناول کے رنگ میں نہیں، اپنے ناول کو جلوس کی صورت میں دیکھا ہے؛ انھوں نے نہیں بھی دیکھا تو تماشائی کو یوں ہی دکھائی دیتا ہے۔

یہ اس لیے کہ اگرچہ ان کی عجیب وغریب مخلوق — گینڈا پہلوان، استاد نتھو، میاں محمد طفیل بی اے، ماسٹر عبدالغفور، مائی خیری، حنیف پہلوان اور اس کا زنانہ بلہر، بہشتی وغیرہ وغیرہ ایک بہت ہی مخصوص بستی میں بستی ہے، اور مصنف نے اس بستی کے گلی کوچوں، کونوں کھدروں کا نقشہ بھی بہت باریکی اور تفصیل سے کھینچا ہے، لیکن ارکان جلوس کچھ ایسی دھما چوکڑی مچاتے ہیں کہ اس پس منظر پر نظر ٹکنے ہی نہیں پاتی۔ پھر یہ ہے کہ بہروپیوں، لفنگوں، مسخروں، قلندروں اور دنیاداروں کا یہ گروہ باری باری سے اپنا تماشا دکھا کر یوں غائب ہو جاتا ہے کہ ان کے سماجی سیاق وسباق اور ذاتی آغاز وانجام کی پوری ٹوہ لگانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی ذاتِ شریف سے ملاقات مکمل ہو، 'جلوس' ختم ہو جاتا ہے اور ملاقات کے اختصار کا گلہ مصنف سے باقی رہ جاتا ہے۔ یہ کامیاب قصہ گوئی کی خوبی بھی ہے۔

اگر آپ کو جلوس کا استعارہ پسند نہ ہو تو آپ اس سارے کاروبار کو ناٹک کہہ لیجیے، لیکن

یہ ناٹک نہ کامیڈی ہے، نہ ٹریجڈی، نہ حقیقت ہے، نہ رومان، البتہ اس کی ترکیب میں یہ سبھی مفردات موجود ہیں۔ اس مرکب کے لیے موزوں ترین نام farce ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ farce محض ہنسی کا گول گپا نہیں، اس کے ہر سوانگ کی آستین میں طنز کے نشتر ہیں۔ ان کی ہنسی ٹھٹھول پر درد اور بے کسی کا سایہ ہے۔ اس کے تفنن میں تلخی کی لاگ، سنجیدگی اور کھلنڈرا پن، بے فکری اور فکرمندی، واقعیت اور غلو، زندگی اور سوانگ، مصنف نے ان کی کچھ ایسی آمیزش کی ہے اور ان کے جوڑ کچھ ایسی صفائی سے بٹھائے ہیں کہ ان کا مرکب مرکبِ تام ہے۔ پھر مصنف نے اس جلوس کے ہر سو، اول سے آخر تک، خوش طبعی اور انسانی ہمدردی کی ایسی فضا تخلیق کی ہے جو مکر و ریا، حماقت اور سنگدلی، بدی اور کراہت کے بہت سے مظاہروں کے باوجود مکدر نہیں ہونے پاتی۔

افراد، ماحول اور فضا کی رعایت سے حمید صاحب یہ قصہ پنجابی زبان میں لکھتے تو شاید زیادہ موثر ہوتا، لیکن ان کے جلوس کا پیکر ایسا جاذب اور جاندار ہے کہ اس کا اندازِ قد قطعِ پیراہن کا زیادہ محتاج نہیں، یہ جلوس بہر رنگ دیدنی ہے۔

فیض احمد فیض

گینڈا پہلوان

1

صرف وہ لوگ علی الاعلان نور پور والے کہلاتے تھے جو نور پور سے شہر آنے جانے کے لیے یا تو کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیوں سے سفر کرتے تھے یا رفیع پان والے کا ٹھیلا استعمال میں لاتے تھے۔ میونسپلٹی کے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم سے آنے جانے والے رہتے تو نور پور میں تھے مگر نہ نور پور والے کہلانا چاہتے تھے نہ کہلاتے تھے، بلکہ ان کی خواہش تھی کہ کسی صورت سرکار نور پور کا نام تبدیل کر دے —— اس کا نام ابو حنیفہ پارک یا رود کی گارڈنز ہو جائے اور بستی بھی لاہور کی دوسری نواحی بستیوں کی طرح، جن میں تمام تر شریف لوگ رہتے ہیں، کسی شریفانہ نام سے پکاری جائے۔ نیز کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیوں سے مسافروں کا آنا جانا غیر قانونی قرار دیا جائے اور ہو سکے تو رفیع پان والے کا ٹھیلا بحق سرکار ضبط کر لیا جائے۔ ان حضرات میں اتنا دل گردہ تو تھا نہیں کہ چاہ میراں روڈ پر جا کھڑے ہوں اور جوں ہی کوئی دودھ والی ریڑھی کھوئی میراں کی طرف سے گرد کا طوفان اٹھاتی قریب آتی نظر آئے، یہ شہر کی طرف منہ کر کے بھاگنے لگیں اور جب ریڑھی ان کے برابر پہنچے، یہ اُچک کر اس کا کٹہرا تھامیں اور ایک ہی قلابازی میں دودھ سے لباب بھری ولٹوہی کے منہ پر رکھی گیلی گھاس کے گٹھے پر ایسے جا تشریف رکھیں جیسے ولٹوہی میں اُگے ہوں۔ ایک دفعہ یہ جم کر جا بیٹھتے تو ظاہر ہے کہ پھر فراٹے بھرتے منٹوں میں لنڈے بازار پہنچ جاتے، مگر نہیں —— شرفا کا خیال تھا کہ کھوئی

میراں کی دودھ والی ریڑھیوں سے سفر خطرناک ہے۔ اگر کوئی عین اس لمحے نہ اچھل سکے جب ریڑھی اس کے برابر پہنچتی ہے، یا کٹہرے پر ہاتھ پڑتے ہی قلابازی نہ کھا سکے تو ایسی پٹخنی کھائے گا کہ سب ہڈی پسلی برابر ہو جائے گی۔ ہاں، اگر ایسی صورتحال پیدا کی جا سکے کہ ریڑھی ان کے قریب پہنچ کر رک جائے، گاڑی بان ریڑھی سے اتر کر گھوڑے کی لگام تھام لے تاکہ آدمی اطمینان سے سوار ہو سکے، ولٹوہیوں پر رکھے گیلی گھاس کے گٹھوں پر تولیہ بچھا لے، اس پر جم کر بیٹھ جائے، کٹہرا دونوں ہاتھوں سے تھام لے اور پھر ریڑھی چلے، تو اس پر سفر کرنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ مگر ان ریڑھیوں کے لیک پر لگے گھوڑے کھوئی میراں سے چھوٹتے ہی ایسے سرپٹ ہو جاتے تھے کہ لنڈے بازار سے اِدھر انھیں روکنا مصیبت مول لینا تھا۔ اگر خود کوئی ریڑھی والا بھی عاقبت نااندیشی سے ذرا لگام کھینچ لیتا تو دیکھتے ہی دیکھتے دودھ والی سب ولٹوہیاں سڑک پر لڑھک جاتیں، اُلٹی ہوئی ریڑھی کے پہیے بدستور گھومتے مگر محض ہوا میں، کوچوان ریڑھی سے کہیں دور پڑا ملتا اور ریڑھی کا گھوڑا، ہر چیز سے بے نیاز، لنڈے بازار کی طرف رواں دواں پایا جاتا۔ میونسپلٹی کے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم سے سفر کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ علی الاعلان نور پور والے کہلانے والوں نے ان گھوڑوں کی خصلتوں کے پیش نظر ہی چلتی ریڑھی پر سوار ہونے کا فن ایجاد کیا تھا، جو شرفا کے بس کی بات نہیں تھی۔

رفیع پان والے کے ٹھیلے کا کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ رفیع کا گھوڑا اڑ کے رہنے سے چلنے کو بہر حال ترجیح دیتا تھا۔ گو سب جانتے تھے کہ اگر اسے بے سوچے سمجھے دو ایک چابک رسید کر دیے جائیں تو ہنسی خوشی چلے گا اور چلتا

رہے گا، مگر رفیع اپنے لاڈلے کے معاملے میں مار پٹائی کے خلاف تھا — کم از کم اپنی آنکھوں سے سامنے اسے پٹتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ گھوڑا بے زبان ہے اور بے زبان پر ہاتھ اٹھانا گناہ ہے۔ آخر یہ بھی جاندار شے ہے اور اگر اس کا چلنے کو جی نہیں چاہتا تو تم صبر کرلو۔ ذرا رک جاؤ، اس کے قریب جا کر اس سے بات کرو، اسے سمجھاؤ کہ دیکھو، شہر جانا ہے، بڑا ضروری کام ہے، چلو چلیں۔ اول تو یہ سنتے ہی گھوڑا بات سمجھ جائے گا اور چلے گا۔ بالفرض بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ نہیں چلتا تو اسے ڈانٹ لگاؤ، سخت سُست کہہ لو، گالی دے لو، خود ہی مان جائے گا۔ رفیع آخر ٹھیلے گھوڑے کا مالک تھا، اس سے بہتر ان دونوں کو کون سمجھ سکتا تھا، اس لیے جسے رفیع کا ٹھیلا درکار ہوتا وہ پہلے تو گھوڑے کے متعلق رفیع کے خیالات سے متفق ہو جاتا کہ بے زبان پر ہاتھ اٹھانا گناہ ہے اور گھوڑا جاندار شے ہے اور بڑی سمجھ بوجھ والی چیز ہے۔ پھر ٹھیلے میں گھوڑا جوتا جاتا اور وہ شخص ٹھیلے پر کھڑا ہو کر، لگام تھامے، گھوڑے کو چلنے پر آمادہ کرنے کی تدبیریں کرنے لگتا۔ لگام کو جھٹکے دے دے کر کہتا کہ چل بھئی چل۔ پھر لگام زور زور سے کھینچ کھینچ کر چھوڑتا اور طرح طرح کی آواز نکالتا — کوئی پیار کی، کوئی نفرت کی، کوئی غصے کی— مگر گھوڑا نہ چلتا۔ سوار گھوڑے سے بالمشافہ گفتگو کے لیے ٹھیلے سے اترتا، اس کے کان سے منھ لگا کر رفیع کی طرح بولتا:

چل نا بیٹے! شہر جانا ہے، بڑا ضروری کام ہے۔ چل، شاباش چل۔''

مگر گھوڑا سر ہلاتا رہتا اور قدم نہ اٹھاتا، جیسے ان باتوں سے اس کے کان میں محض ایک کھجلی سی ہوتی ہے جو سر ہلانے سے دور ہو جاتی ہے۔ چلنے چلانے کے ذکر ہی میں نہ

پڑتا۔ اس پر سوار کو تاؤ آ جاتا۔ وہ ماں بہن کی گالی دیتا اور رفیع کی طرف دیکھتے ہوئے چلا چلا کر گھوڑے کو سمجھاتا کہ اگر وہ نہ چلا تو مارے سَنٹیوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دی جائے گی۔ اس پر گھوڑا بھی رفیع کی طرف دیکھنے لگتا مگر ٹس سے مس نہ ہوتا۔ رفیع دیکھتا کہ حالات کچھ بگڑ رہے ہیں تو دکان کے تھڑے سے اترتا۔ دو چار چوک والے بھی تماشا دیکھنے آ جاتے اور رفیع کی قیادت میں سب باری باری اور پھر یک زبان ہو کر گھوڑے کو ہزار ہزار مغلّظات سناتے۔ ان کے شور سے ہجوم جمع ہونے لگتا اور آہستہ آہستہ ہجوم کا پارہ اس بات سے چڑھنے لگتا کہ یہ ذرا سی ذات گھوڑے کی اور اتنے نور پور والوں کی بات نہیں مانتی۔ جب رفیع کو محسوس ہونے لگتا کہ بلوے کے امکانات بڑھ رہے ہیں، کسی نے نورے دودھ والے کی بھٹی سے لکڑی نکال لی ہے، کوئی اینٹ تھامے چلا آ رہا ہے، کوئی کھڑا کھڑا مکّے کس رہا ہے تو پکار پکار کر کہتا:

''بس اب ہٹ جاؤ، پیچھے ہو جاؤ۔ دیکھو یہ کم ذات ابھی چلتا ہے۔''

لوگ ایک ایک دو دو قدم پیچھے ہٹ جاتے۔ رفیع قمیض کی آستین اور شلوار کے پائینچے چڑھاتا اور گھوڑے کا ایک کان مضبوط پکڑ کر، پیچھے دیکھے بغیر کہ ہجوم کیا کر رہا ہے، گھوڑے کو گھسیٹتا ہوا بھاگنے لگتا۔ گھوڑا پوری مستعدی سے اپنی جگہ پر جمے رہنے اور رفیع کو روکنے کی کوشش کرتا مگر اس پکڑ دھکڑ میں کوئی نہ کوئی ایک دولتّی یا لکڑی ایسی جماتا کہ رفیع کو تو کچھ معلوم نہ ہوتا مگر گھوڑا بلبلا کر ہرن کی طرح قلانچیں بھرنے لگتا۔ گھوڑا ایک دفعہ ہلا نہیں کہ ٹھیلے سوار نے لگام دوہری کر کے پٹاپٹ اس کی مرمت شروع کر دی، اور ٹھیلا یہ جا وہ جا۔ اتنے میں رفیع سڑک کے کنارے کپڑے جھاڑتا ملتا اور مسکرا مسکرا کر کہتا:

''میں نہ کہتا تھا چل پڑے گا۔ مار پٹائی سے کوئی زیادہ اچھا تو نہیں چلتا۔''

رفیع کے کانوں میں سنٹی کی سائیں سائیں اور لگام کی تڑاک تڑاک آتی تو وہ بے حال ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اور خاموشی سے اپنے مکان کے تھڑے پر واپس آ کر پان لگانے لگتا۔ لوگ اِدھر اُدھر ہو جاتے، مگر جہاں کسی سے اس کی آنکھیں چار ہوتیں، وہ سسکتا ہوا بول اٹھتا:

''بے زبان پر ہاتھ اٹھانا گناہ ہے!''

میونسپلٹی سے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم سے سفر کرنے والوں کو رفیع کے گھوڑے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، بلکہ انھیں اس سے ہمدردی تھی — خطرناک چیز وہ ٹھیلے کو سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا، اور یہ خیال بالکل درست تھا، کہ رفیع نے یہ ٹھیلا خود بنایا ہے اور اس میں ٹھیلوں والی کوئی بات نہیں۔ اس نے محض ایک تختہ لے کر اس کے دو طرف ایک ایک بانس کیلوں سے جڑ دیا تھا کہ گھوڑا ان کے درمیان جوتا جا سکے اور تختے کے نیچے لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ دو کنڈوں میں پھنسا دی تھی کہ اس کے دونوں کناروں پر ایک ایک پہیہ چڑھا دیا جائے۔ یہ سب مال اس نے لنڈے بازار کے کباڑیوں کے ہاں سے وقتاً فوقتاً خریدا تھا اور کوئی سی دو چیزیں آپس میں جوڑ نہیں کھاتی تھیں۔ اس ٹھیلے کے نہ کوئی کمانی تھی، نہ ڈھنگ کا دُھرا، نہ پہیوں پر ٹائر۔ دونوں پہیے مختلف زاویے بناتے تختے سے رگڑتے رہتے تھے اور مختلف نوع کی آوازیں نکالتے رہتے تھے۔ ان آوازوں کا صدر مقام کبھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ چلتے چلتے کبھی اس کا دایاں پہیہ اور کبھی بایاں خود بخود سڑک سے اٹھ کر دوسری جانب پہنچنے کی کوشش کرنے لگتا اور کبھی کبھی ٹھیلے سے

آزاد ہو کر، سڑک سے اتر کر کسی اور ہی طرف نکل جاتا۔ پہیوں کی اس خودسری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ٹھیلا سوار اس کے تختے پر بیٹھتے نہیں تھے، بلکہ کھڑے کھڑے چلتے تھے تاکہ جس ہاتھ کا پہیہ بغاوت پر آمادہ نظر آئے فوراً اپنا سارا بوجھ اُدھر منتقل کر کے اس فتنے کو وہیں دبا دیا جائے۔ اس طرح ٹھیلے سے کوئی ناجائز حرکت عمل میں نہیں آتی تھی۔ پھر بھی ٹم ٹم سے سفر کرنے والے سمجھتے تھے کہ ٹھیلا اُلٹنے کا ہر قدم پر خطرہ ہے اس لیے یہ سواری خطرناک ہے، مگر نور پور والے ان کی کب سنتے تھے؛ وہ ماہرین ٹھیلا تھے۔ اوّل تو وہ اسے الٹنے نہیں دیتے تھے، اور اگر کبھی کوئی ایسی ویسی حرکت ہو جائے تو وہ ٹھیلے کو پھر سیدھا کر لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چوک کے اکثر لڑکے بڑی کامیابی کے ساتھ اس ٹھیلے پر سرکس کرتے تھے اور ایک پہیے کی سائیکل چلانے والی لیڈی کے سب کرتب چوک ہی میں کر کے دکھا دیتے تھے۔

اگر ٹم ٹم سے سفر کرنے والوں کو کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیوں اور رفیع پان والے کے ٹھیلے پر اعتراض تھا تو علی الاعلان نور پور والے کہلانے والوں کو میونسپلٹی کے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم سے نفرت تھی۔ ان کی رائے تھی کہ اس کے سفر سے پیدل چلنا بہتر ہے۔ اڈہ کوتوالی سے نور پور کا چوک چار نہیں تو پانچ میل ہوگا۔ دودھ والی ریڑھیاں ہوں یا رفیع پان والے کا ٹھیلا، یہ سفر پندرہ منٹ میں طے ہو جاتا تھا، مگر سارے نور پور میں ایک شخص ایسا نہیں تھا جو گواہی دے کہ میونسپلٹی کا منظور شدہ ربڑ ٹائر والا ٹم ٹم کبھی ایک مرتبہ بھی ایک گھنٹے سے کم عرصے میں اڈہ کوتوالی سے نور پور کے چوک تک پہنچا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ٹم ٹم ہر مسافر کو اڈہ کوتوالی کے تعفن میں گھنٹے دو گھنٹے انتظار کرواتا تھا کہ چار مسافر

پورے ہوں تو یہ چلے۔ سالم ٹم ٹم کرانے والا ماں کا لال ابھی کوئی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ٹائر اس کے ربڑ کے تھے جو گرمیوں میں پگھل کر اور سردیوں میں سکڑ کر اتر جاتے تھے، اور ٹم ٹم والا طرح طرح کے اینٹ پتھروں سے انھیں ٹھونک ٹھونک کر، اوپر رسیاں، چیتھڑے اور قسم قسم کے تار باندھ کر، بڑی احتیاط سے چلتا تھا، مگر یہ پھر بھی جمے نہیں رہتے تھے۔ کمانیاں اس کی نہایت مہین اور ایسی لچکدار تھیں جیسے یہ مال روڈ پر چلنے کے لیے بنایا گیا ہو۔ پہیے کے نیچے ایک معمولی سا کنکر بھی آ جائے تو سارے کا سارا ٹم ٹم اچھل پڑتا تھا جیسے چاول کھاتے کھاتے ریت کا دانہ دانت کے نیچے آ گیا ہو۔ اوپر چھت تمام راستے مسافروں کے سروں کی مالش کرتی رہتی تھی اور ٹوپی پہننے والوں یا پگڑی باندھنے والوں کی قدم قدم پر بے عزتی کرتی رہتی تھی۔ جتنا عرصہ یہ ٹم ٹم جرنیلی سڑک پر چلتا رہتا، یوں معلوم ہوتا کہ کوئی کشتی جھیل پر جا رہی ہے۔ جونہی دونالی پل سے نکل کر چمرنگوں کے احاطے کے پچھواڑے چاہ میراں روڈ پر پہنچتا، بس ایک بھونچال شروع ہو جاتا جو نور پور کے چوک تک مسلسل جاری رہتا۔ اس کا گھوڑا قدم قدم پر ناراض ہونے لگتا اور بگڑ کر رک جاتا۔ کہیں ہچکولا لگتا تو ٹم ٹم آگے کھینچنے کی بجائے پیچھے دھکیلنے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہچکولوں کے حق میں سرے سے نہیں ہے۔ کیچڑ پانی میں چلنا بالکل سیکھا ہی نہیں تھا۔ یوں پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا جیسے اسے اپنے سُم مَیلے ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ کہیں ذرا سا پانی بھی گڑھے میں کھڑا نظر آتا تو یہ بدک اٹھتا۔ اول تو رک جاتا، جیسے کہتا ہو کہ پہلے یہاں کا پانی ہٹاؤ پھر میں گزروں گا، اگر اس سے بچ کر نکل جانے کی کوئی صورت اسے نظر آ جاتی تو ٹم ٹم کا پہیہ دھک سے گڑھے میں ڈال کر خود بالکل الگ ہو کر کھڑا ہو جاتا۔ یہ نہیں کہ زور لگائے

اور ٹم ٹم نکال کر لے جائے۔ نہیں، جب تک کوچوان خود ٹم ٹم میں نہ جُت جاتا اور تمام مسافر اتر کر پہیہ نہ مارتے، ٹم ٹم گڑھے میں پھنسا پڑا رہتا۔ غرض کہ یہ ٹم ٹم اور اس کے مسافر، کبھی سوار، کبھی پیدل، کبھی پگڑیاں سنبھالتے اور کبھی ٹم ٹم کو دھکیلتے، کبھی چلتے، کبھی رکتے، گھنٹے بھر میں بھی چوک نور پور میں پہنچ جاتے تو گویا بڑا معرکہ سر کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ نور پور والے کہلانے والوں کو ان نازنخروں کا دماغ نہیں تھا۔ انھیں کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیاں منٹوں میں شہر لے جاتی تھیں اور واپس لے آتی تھیں، اور بالکل مفت۔ ٹم ٹم والے کو تو ایک آنہ کرائے کا بھی دینا پڑتا تھا جو محض ضائع جاتا تھا۔ ایک آنے کے سولہ بادام ملتے تھے، بیس اخروٹ ملتے تھے، پاؤ بھر دودھ ملتا تھا، اور ان چیزوں سے دماغ کو تراوٹ اور جسم میں قوت آتی تھی۔ ٹم ٹم کے سفر میں کیا ملتا تھا؟ رفیع کا ٹھیلا بھی ہر ایک کی قسمت کا لکھا ٹالے بغیر ہر سہولت اور تفریح کا سامان مہیا کرتا تھا۔ اس کے تو خیر ٹائر کی کمانیاں اور دُھرے تھے ہی نہیں کہ ان کی وجہ سے کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا، مگر دودھ والی ریڑھیوں کے یہ سب کچھ لگا تھا لیکن اس قدر مضبوط کہ کنوئیں میں بھی ڈال دو تو ہچکولا تک نہ لگے۔ ان کے گھوڑے ایسے جی دار تھے کہ نہ کبھی گڑھوں سے ڈرے نہ میلوں تک کھڑے پانی سے، بلکہ گڑھا اور پانی دیکھ کر اَور شیر ہو جاتے تھے۔ گڑھوں میں ریڑھی ڈال دیتے تھے جیسے علامہ اقبال کے مومن ہوں اور انھیں سامنے آتش نمرود نظر آ رہی ہو اور انھیں اللہ کی ذات اور کرم پر بھی پورا بھروسا ہو۔ پانی یوں پار کرتے تھے جیسے کسی عصائے موسوی کے طفیل آدھا سمندر دائیں اور آدھا بائیں ہٹ گیا ہو اور یہ دو آبی دیواروں کے درمیان خشکی پر چلے جا رہے ہوں۔ کیچڑ دیکھ کر اس قدر تیز ہو جاتے تھے کہ

مال روڈ پر نہ ہوں۔ انھیں یہ بھی تو معلوم تھا کہ ذرا رفتار کم کی تو ایسے پھنسیں گے کہ ایڑی چوٹی کا زور بھی لگانا پڑے گا اور ریڑھی والا مارے چابکوں کے کھال بھی ادھیڑ دے گا— وہ بھلا ریڑھی کیوں پھنسنے دیتے۔ جن لوگوں کو ایسی بے دھڑک سواریاں میسر آتی تھیں وہ میونسپلٹی کے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تو کیا کرتے؟

ٹم ٹم سے سفر کرنے والوں کو اس سواری کی تمام تکلیفوں اور اس کے سفر کی تمام کوفت کا احساس تھا اور اعتراف بھی، مگر ان کی رائے یہ تھی کہ اس میں قصور نہ ٹم ٹم کا ہے، نہ ٹم ٹم کے گھوڑے کا، نہ ٹم ٹم والے کا اور نہ ان کا اپنا، بلکہ اس مصیبت کی تمام ذمے داری چاہ میراں روڈ بنانے والوں پر آتی ہے، یعنی سرکار پر۔ یہ سڑک ہی کچھ ایسے بنی تھی کہ کوئی سواری تو کیا، پیدل چلنے والے بھی اسے آسانی سے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تھا اعتراض۔ واقعہ یہ تھا کہ چاہ میراں روڈ ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام سرکاری کاغذات میں پختہ دکھائی گئی تھی، کہیں ایک انچ بھی خام نہیں تھی، تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ جنگ کے دنوں میں بنی تھی۔ اس پر پہلے اینٹوں کا فرش بچھایا گیا، فرش پر پتھر بچھائے گئے، پتھر پر تارکول چھڑکا گیا، پھر لوہے چینی کی سفید تختیوں پر سیاہ جلی حروف میں "چاہ میراں روڈ" لکھوا کر جگہ جگہ نصب کیا گیا تاکہ مسافر راستہ نہ بھول جائیں، مگر سڑک کوٹنے کے انجنوں کی کمی کی وجہ سے، جو سب کے سب جنگ پر گئے ہوئے تھے، پتھر کوٹنے اور سڑک ہموار کرنے کا کام کچھ دستی مگدروں سے کیا گیا اور باقی بیل گاڑیوں، دودھ والی ریڑھیوں، ٹھیلوں، ٹمٹموں اور پیدل چلنے والے عوام الناس کے سپرد کر دیا گیا۔ ان سب نے مل کر اسے حسبِ توفیق کوٹ پیٹ کر برابر کر دیا، یعنی حکومت سے پورا

تعاون کیا، اور اگر حکومت کو کچھ خیال ہوتا تو جنگ ختم ہونے پر ان سب کو تمغے عنایت کرتی۔ ان سب کی پوری کوششوں کے باوجود کہیں کہیں اس سڑک پر کچھ گڑھے سے رہ گئے تھے۔ ایک دو تو کچھ گہرے بھی تھے مگر زیادہ تر اتنے گہرے نہیں تھے جتنے وسیع تھے۔ ان میں صرف ایک گڑھا بہت بڑا تھا۔ یوں کہیے کہ کوئی میل بھر سڑک کا ٹکڑا ایک ہی گڑھا تھا جو دونوں طرف کے میدانوں سے کسی قدر پست تھا۔ برسات کے موسم میں چاروں طرف کا بارش کا پانی یہاں آ کر جمع ہو جاتا تھا اور باقی موسموں میں صرف جوہڑوں یا گندی نالیوں کا پانی آتا تھا۔ یہ حصہ ہر موسم میں اپنے ماحول سے پوری طرح متاثر رہتا تھا، اکثر اس میں مدغم رہتا تھا، صرف جب چاروں طرف کا پانی سوکھ جاتا تو یہ ذرا الگ الگ سا نظر آتا، کیونکہ یہاں بارہ مہینے دلدل رہتی تھی، ورنہ کبھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ بھلی چنگی سڑک آتے آتے کدھر غائب ہو گئی ہے۔ اسی لیے میونسپلٹی نے پبلک کی سہولت کے لیے سر بسر بجلی کے کھمبوں کی ایک قطار کھنچوادی تھی تاکہ سڑک کی موجودگی کا ہر موسم میں اعلان ہوتا رہے اور اجنبی مسافر بھی راہِ راست پر قائم رہیں۔ بہر حال، ٹم ٹم سے سفر کرنے والے لوگ کہتے تھے کہ ٹھیکیدار رشوت دے گئے، افسر روپیہ کھا گئے اور یہ سڑک پختہ نہیں، خام نہیں، سرے سے سڑک ہی نہیں۔ جو لوگ علی الاعلان نور پور والے کہلاتے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ باتیں میونسپلٹی کے منظور شدہ ربڑ ٹائر والے ٹم ٹم کی کمزوریوں، اس کے گھوڑے کی بزدلی، ٹم ٹم والے کی حرص اور ٹم ٹم پر چڑھنے والوں کی بیوقوفی چھپانے کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اگر اعتبار نہیں آتا تو کھوئی میراں کی دودھ والی ریڑھیوں یا رفیع پان والے کے ٹھیلے پر سوار ہو جائیے اور ایک بار نہیں ہزار بار شہر جا آ کر

دیکھ لیجیے کہ کون صحیح کہتا ہے اور کون غلط — اور اگر یہ بھی منظور نہیں، یہ سڑک سرے سے آپ کو بری لگتی ہے، تو نور پور میں مت رہیے؛ نہر کے کنارے بنگلہ بنوا لیجیے یا لاٹ صاحب کی کوٹھی میں جا رہیے۔ ہماری بستی، اس کا نام اور اس کی سڑکیں ہمیں بالکل ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتی ہیں۔

تمام چوک والوں کا اس معاملے میں مکمل طور پر اتفاق تھا۔

2

چاہ میراں روڈ پر بجلی کے کھمبوں کی قطار ڈورے شاہ کے مزار تک آتی تھی اور پھر بائیں ہاتھ مڑ کر نور پور میں چلی جاتی تھی۔ یہ کھوئی میراں کے لیے نہیں بلکہ نور پور کو بجلی دینے کے لیے کھینچی گئی تھی، کیونکہ نور پور سکیم حکومت سے منظور شدہ تھی اور چاہ میراں صدیوں پرانی بستی تھی۔ اس کی سکیم کبھی بنی نہیں تھی، اس لیے منظور شدہ بھی نہیں تھی، چنانچہ اس کو بجلی کی ضرورت نہیں تھی — اگر سو برس سے اوپر وہ بغیر بجلی کے پھولتی پھلتی رہی تھی تو اب بجلی لے کر اسے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

ڈورے شاہ کے مزار کے برابر ایک بہت بڑا تختہ لگا تھا جو نور پور کے محلِ وقوع کا ایسے اعلان کر رہا تھا جیسے ریلوے سٹیشنوں پر پلیٹ فارم کے دونوں طرف سٹیشن کا نام لکھا رہتا ہے۔ فرق اتنا تھا کہ تختے کے اوپر تو موٹا سا لکھا تھا: ''نور پور سکیم (حکومت سے منظور شدہ)'' اور نیچے ایک نقشہ بھی بنا تھا۔ نقشے میں چاہ میراں روڈ بالکل نچلے سرے پر دائیں سے بائیں جاتی دکھائی گئی تھی اور اس کے درمیان سے ایک سڑک نیچے سے اوپر کو آتی تھی۔ اس پر لکھا تھا: ''پچاس فٹ چوڑی سڑک۔'' ایک اَور سڑک چاہ میراں روڈ کے متوازی دائیں سے بائیں جاتی ہوئی نیچے سے اوپر آنے والی سڑک کو دو حصوں میں کاٹتی تھی اور خود بھی دو برابر حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ اس پر بھی جگہ جگہ لکھا تھا: ''پچاس فٹ

چوڑی سڑک۔‘‘ ان دونوں کے متوازی درجنوں گلیاں تھیں اور ان کے بیچ والی جگہ چار چار چھ چھ ٹکڑوں میں بٹی تھی۔ کہیں لکھا تھا: ’’پلاٹ ہائے برائے رہائشی مکان ہائے،‘‘ کہیں: ’’ٹکڑہ جات سفید زمین برائے احاطہ جات و بنگلہ ہائے،‘‘ اور کہیں ’’پلاٹ ہائے برائے دکان ہائے‘‘ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں سرخ روشنائی سے لکھا تھا: ’’مزید معلومات اس پتے سے حاصل کیجیے۔ جناب میاں محمد طفیل صاحب، بی اے، گورنمنٹ کنٹریکٹر اینڈ کمیشن ایجنٹ، بیرون اکبری دروازہ، لاہور۔‘‘

یہ بورڈ اور یہ نقشہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ نور پور باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے، یہ بستی جنت نظیر ہوگی۔ ہر چیز اور ہر بات ایک ضابطے اور ایک نظام کے ماتحت ترتیب پائی ہوگی۔ پختہ سڑکیں پچاس پچاس فٹ چوڑی اور گلیاں پچیس پچیس فٹ چوڑی نہایت صاف ستھری ہوں گی۔ ان کے کنارے خوشنما مکان ہوں گے اور بازاروں میں نفیس نوار سے بھری دکانیں۔ لوگ سلیقے سے رہتے ہوں گے اور نئی بستی کی کھلی فضا میں صحت مند زندگی پروان چڑھ رہی ہوگی۔ یہاں پرانے شہر کی متعفن گلیاں ہوں گی نہ ان کے بیچوں بیچ چلتی گندی نالیوں پر ننگے بچے بیٹھے رفعِ حاجت کر رہے ہوں گے۔ مگر جونہی اس بورڈ والے نقشے کو بھول کر اور ڈورے شاہ کے مزار والے گنبد پر چڑھ کر نور پور کو دیکھا جاتا تو معلوم ہوتا کہ وہ سڑکیں چوسر کی بساط کی طرح بچھی ہیں اور چاروں طرف اکا دکا مکان یوں بکھرے پڑے ہیں جیسے مرے ہوئے مُہرے اوندھے سیدھے دھرے ہوں۔ مکانوں اور دکانوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے لاہور میں ایک زبردست بھونچال آیا ہے اور اس کے درجنوں بوسیدہ مکان بنیادوں سے اکھڑ کر چاہ میراں روڈ کے گڑھوں اور

کھڑے پانی پر لڑھکتے لڑھکتے آئے اور اس میدان میں یہاں وہاں رک گئے ہیں۔ ان میں نہ کوئی ترتیب تھی نہ ربط تھا — معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب بالکل لاوارث ہیں۔

ڈورے شاہ کے مزار کے برابر جو سڑک نکلتی تھی اور بورڈ والے نقشے پر نیچے سے اوپر جاتی دکھائی گئی تھی، اسے نور پور والے ''ٹھنڈی سڑک'' کہتے تھے۔ یہ دو میل لمبی تھی اور چوک سے آگے مہر جیون کے کنویں تک پہنچ کر دو کچے راستوں میں بٹ جاتی تھی۔ مہر جیون کا کنواں ان دونوں کچے راستوں کے درمیان تھا اور اس کی زمین ایک تکون کی صورت میں دور تک چلی گئی تھی۔ ایک کچا راستہ کھیتوں میں بل کھاتا چاہ میراں کے پچھواڑے سے ہوتا ہوا مادھولال حسین کی درگاہ کو چلا جاتا تھا اور دوسرا دریائے راوی کو۔ سارا سال ان کچے راستوں پر صرف شہر کی گندگی سے لدی بیل گاڑیاں چلتی نظر آتی تھیں جو شہر کو تازہ سبزی بہم پہنچانے والے کھیتوں میں کھاد لا لا کر ڈالتی تھیں۔ بسنت کے دن یہ راستے یکدم جاگ اٹھتے تھے۔ لوگ پیلی پیلی پگڑیاں باندھے، ہاتھوں میں پتنگ اور رنگ برنگی ڈور کی ریل لیے، اسی راستے مادھولال حسین کی درگاہ کو جاتے تھے۔ یہاں اس روز خوانچے والے بھی آ بیٹھتے تھے اور درجنوں فقیر — کوئی لولا، کوئی لنگڑا، کوئی نابینا، کوئی گاتا، کوئی روتا، کوئی محض اپنی وضع قطع سے راہگیروں کی توجہ پر ڈاکے ڈالتا۔ غرض کہ ایک دن کے لیے یہ راستہ انارکلی بازار بن جاتا اور پھر وہی کچے کا کچا راستہ!

مہر جیون کا کنواں نور پور کی حد قائم کرتا تھا۔ اس کے آس پاس جامن کے پیڑوں کے کئی ایک جھنڈ تھے۔ پہلے جھنڈ کے قریب، کنویں کے عین برابر، حنیف پہلوان کا اکھاڑا تھا جہاں نور پور اور دوسری نواحی بستیوں کے مسلمان نوجوان ہر شام ورزش کرنے

آتے تھے۔ یہ حنیف پہلوان کے شاگرد کہلاتے تھے — کم از کم حنیف پہلوان ان سب کو اپنا شاگرد بتاتا تھا۔

جامن کے پیڑوں کے پہلے اور دوسرے جھنڈ کے درمیان اگلے وقتوں کی دو چار قبریں تھیں۔ مہر جیون کا خیال تھا کہ یہ اس کے اجداد کے مزار ہیں، مگر وثوق سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں۔ مہر جیون محض عقیدت سے برسات کی برسات ان پر مٹی اور بھس کا پلستر کروا دیتا تھا اور اس علاقے میں ہل نہیں چلنے دیتا تھا۔ سائیں بھولا ان کے متعلق کئی مرتبہ مہر جیون اور حنیف پہلوان سے گفتگو کر چکا تھا اور ان کی حُرمت کا احساس دونوں میں بیدار ہو چکا تھا۔ ایک سال بسنت سے چند ہی روز پہلے سائیں بھولے کو خواب میں بشارت ملی کہ سڑک کے قریب ترین قبر دراصل ایک بزرگ لال بادشاہ کی ہے۔ لال بادشاہ نے اپنی تاریخ پیدائش بسنت کا دن بتائی اور سائیں بھولے سے کہا کہ اس خواب کو معمولی خواب نہ سمجھے بلکہ سیدھا مہر جیون کے پاس جائے اور اس کی اجازت سے لال بادشاہ کا عرس منعقد کرنے کا انتظام کرے۔ حنیف پہلوان تو پہلے ہی اس مقام اور اس درگاہ کے امکانات کا قائل تھا، اب سائیں بھولے نے جب اپنی بشارت کی داستان سنائی تو مہر جیون کو بھی احساس ہوا کہ اتنے بڑے بزرگ کے مزار کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس نے سائیں بھولے کو مجاور مقرر کر دیا اور تینوں نے مل کر بسنت کے روز ایسے ٹھاٹھ کا عرس کیا کہ ہر سال ایک کے بجائے دو جگہ بسنت کے میلے لگنے لگے۔ ادھر جب نور پور کی سڑکیں بننے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا تو سائیں بھولے نے درگاہ پختہ بنالی اور اس کے برابر ایک کوٹھڑی بھی کھڑی کر لی تاکہ سائیں اور

اس کے بالکے شمّے کے لیے درگاہ کے قریب ہی رہنے کا انتظام ہو جائے۔ اِدھر حنیف پہلوان کا اکھاڑا، اُدھر لال بادشاہ کی درگاہ، اور درمیان میں مہر جیون کا کنواں۔ تینوں کاروباری آدمی ایک دوسرے کی معاونت سے نور پور کے تین ستون بن گئے اور ان کے کاروبار کو اتنا عروج ہوا کہ یہ ہمیشہ ٹم ٹم سے شہر آنے جانے لگے۔

نور پور کی دوسری پچاس فٹ چوڑی سڑک ''عزیز روڈ'' کہلاتی تھی اور وہ اس لیے کہ اس کے چاہ میراں والے کنارے پر جو احاطہ ''کمہاروں کے احاطے'' کے نام سے مشہور تھا، اور جس میں ایبنہ رہتی تھی، بابو عبدالعزیز اوورسیئر میونسپلٹی کی ملکیت تھا۔ جب میاں محمد طفیل بی اے نے نور پور کی سکیم تیار کی اور اسے حکومت سے منظور کروانے کا کام بابو عبدالعزیز اوورسیئر کے سپرد کیا تو بابو عبدالعزیز نے یہ شرط رکھ دی تھی کہ اول تو اس کا احاطہ ایک پچاس فٹ چوڑی سڑک پر آئے گا اور دوسرے یہ سڑک عزیز روڈ کہلائے گی۔ میاں محمد طفیل بی اے نے دونوں شرطیں منظور کر لی تھیں۔ چنانچہ تمام سرکاری کاغذات میں اس سڑک کا نام عزیز روڈ ہو گیا، گو ان ہی کاغذات میں بابو عبدالعزیز کا احاطہ کمہاروں کا احاطہ ہی لکھا گیا اور اسی نام سے اب تک پکارا جاتا ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مہر جیون چاہتا تھا کہ اس سڑک کا نام ''مہر جیون روڈ'' رکھا جائے، کیونکہ اسی سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک احاطہ، جس میں مائی خیری اور گینڈا رہتے تھے، مہر جیون کی ملکیت تھا اور ''مہر جیون کا احاطہ'' کہلاتا تھا۔ مگر میاں محمد طفیل بی اے نے سرکاری کاغذات کے حوالے سے ثابت کر دیا کہ سکیم کے نام میں جو لفظ 'نور' ہے، یعنی وہ نام جس کی رعایت سے یہ بستی نور پور کہلائے گی اور حکومت کی منظور شدہ سکیم کے مطابق

تعمیر ہو گی، دراصل مہر جیون کے آٹھویں پشت میں دادا نور دین کے نام سے رکھا گیا ہے، اسی لیے تو مہر جیون کا احاطہ پچاس فٹ چوڑی سڑک پر آتا ہے۔ یہ دلیل اتنی صائب تھی کہ مہر جیون قائل ہو گیا اور اس نے سڑک کا نام عزیز روڈ رکھنا منظور کر لیا۔

جہاں ٹھنڈی سڑک عزیز روڈ کو کاٹتی تھی وہ چوک ''چوک نور پور'' کہلاتا تھا۔ یہ نور پور کی ساری زندگی کا مرکز تھا۔ یہاں آبادی مربوط تھی اور دکانیں بارونق۔ عین نکڑ پر رفیع پان والے کی دکان تھی جس کے آگے اس کا گھوڑا بندھا رہتا تھا اور اس کے قریب ٹھیلا کھڑا رہتا تھا۔ اس کے برابر نورے دودھ والے کی دکان تھی۔ اس کا اور رفیع کی دکان کا تھڑا مشترک تھا اور نور پور کی سڑکیں بننے کے واقعے پر تعمیر ہوا تھا۔

اسی لیے اس تھڑے پر سارے نور پور کا حق تھا۔ یہاں ہر شخص آ کر بیٹھ سکتا تھا، چوسر، شطرنج یا تاش کھیل سکتا تھا، تھڑے کے حقے کے لیے رفیع سے تمبا کو اور نورے سے آگ لے سکتا تھا، تازہ ترین اطلاعات سن سکتا تھا، خبریں سنا سکتا تھا اور ہر معاملے میں رائے دے سکتا تھا، اور چاہے تو رات کو اس پر سو بھی سکتا تھا۔ سردیوں میں نورے کی بھٹی کے آس پاس تھڑا کافی گرم جگہ بن جاتا تھا مگر یہاں سونا کچھ مشکل تھا کیونکہ سارے نور پور کے کتے رات کو یہیں جمع ہو جاتے تھے اور وہ اپنا بستر دوسروں کو دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

رفیع اور نورے کی دکانوں کے بالمقابل رانجھے حجام کا گرم حمام تھا جہاں سے نور پور کے تمام لوگ جمعرات کے جمعرات سرخ ڈنڈیوں والے استرے مانگ مانگ کر لے جاتے تھے۔ کچھ تو انھیں مسجد میں لے جا کر استعمال کرتے تھے، مگر جو لوگ دو آنے

غسل پر بھی خرچ کر سکتے تھے وہ انھیں حمام میں ساتھ لے جاتے۔ ان استروں کی اتنی مانگ رہتی تھی کہ اکثر لوگ محض ان کے انتظار میں رانجھے کی دکان پر بیٹھے رہتے تھے اور دکان کی رونق میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ گو رانجھا عام طور پر یہ چاہتا تھا کہ اس کی دکان پر جمعرات اور جمعے کو چوک کے لڑکے زیادہ نہ آئیں۔ یہ دو دن ایسے تھے جب نور پور کے شرفا، مثلاً بابو کرم داد، ماسٹر طالع مند وغیرہ، ڈاڑھیوں پر وَسمہ لگائے، سر پر مہندی کی تہہ جمائے، مونچھوں پر اُرنڈ کے پتے باندھے، رانجھے کی دکان پر گھنٹوں آ کر بیٹھتے تھے، ناخن ترشواتے تھے، ناک اور کان کے بال چُنواتے تھے، خط بنواتے تھے اور پھر دو آنے والا حمام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی خاطر رانجھے کو بہت منظور تھی۔ اسے خوف رہتا تھا کہ یہ لوگ شور مچا کر اس کے بھائی کا کاروبار بند نہ کروا دیں، اسی لیے جب کبھی ان میں سے کوئی بزرگوار انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی یہ لمبی چٹھی اس کے پاس لے کر آتا جس میں یہ لکھا ہوتا کہ حکومت کو نور پور کا نام تبدیل کر دینا چاہیے، یا نالیاں پختہ بنا دینی چاہییں، یا فلاں فلاں شخص کو نور پور سے نکال دینا چاہیے، تو رانجھا بغیر پوچھے دستخط کر دیتا اور فرضی ناموں کے نیچے کئی انگوٹھے لگا دیتا۔

رانجھے کا بڑا بھائی نتھو گانے بجانے کا کام کرتا تھا۔ اس کے لیے رانجھے نے اپنی دکان کے پیچھے ایک بیٹھک کرائے پر لے رکھی تھی۔ بیٹھک میں صرف ایک کمرہ تھا، اس کے سامنے ایک برآمدہ اور چھوٹا سا صحن تھا۔ صحن کے ایک کونے میں ہینڈ پمپ لگا تھا اور آگے پختہ جگہ نہانے کے لیے بنی تھی۔ یہ جگہ نتھو کا صدر مقام تھی۔ وہ یہیں رہتا تھا اور یہیں اپنے شاگردوں کو ٹرمپٹ، کلارنٹ، ڈھول، ڈگڈگی وغیرہ بجانے کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ یہ

اپنے آپ کو امرتسر کے مشہور بینڈ ماسٹر جہانگیر کا شاگرد بتاتا تھا اور کہتا تھا کہ ''میں جہانگیر کے بینڈ باجے میں کلارنٹ بجاتا تھا۔ استاد مجھ سے جلتا تھا۔ استاد چونکہ خود بھی کلارنٹ بجاتا تھا اس لیے اکثر میرا اس کا مقابلہ ہو جاتا تھا۔ سننے والے کہتے تھے کہ استاد نھو جہانگیر سے اچھی کلارنٹ بجاتا ہے۔ استاد میری تعریف بالکل نہیں سن سکتا تھا، حالانکہ دل میں سمجھتا تھا کہ میں اس سے کہیں اچھا ہوں مگر ناراض ہوتا۔ کہتا، تیرا سُر ہی ٹھیک نہیں ہے۔ اب باج تو خدا کی دین ہے، کسی کو مل جائے، میں کیا کرتا۔ کلارنٹ تو میں وہ بجاتا تھا جو بجانے کی شرط ہے۔ تنگ آ کر میں نے جہانگیر کا ساتھ چھوڑ دیا۔''

چوک والے نھو کی باتیں سن کر ہنسی میں اڑا دیتے۔ نھو کی صورت دیکھ کر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ شخص اُس بینڈ میں کلارنٹ بجاتا رہا ہے جسے دیکھنے اور سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ اس کانے چرسی کے سینے میں اتنا دم نہیں تھا کہ کلارنٹ پر گھنٹے دو گھنٹے ریاضت ہی کر سکے۔ جلوس میں چلنا اس کے بس کا نہیں تھا۔ بات یہ تھی کہ نھو کی بنیادی غذائیں بھنگ، چرس اور افیون پر مشتمل تھیں۔ کوئی سی نشہ آور چیز مل جائے، نھو اسے ضرور استعمال کرتا تھا۔ ایک دفعہ کسی نے اسے دھتورے کے پھول دے دیے کہ ان کا نشہ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ نھو کھا گیا اور کئی دن تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکا رہا۔ بچ گیا تو کہنے لگا:

''واہ! نشوں میں نشہ ہے تو دھتورے کے پھولوں کا! مرشد، خدا یاد آ جاتا ہے۔ وہ نشہ ہے جو نشے کی شرط ہے۔''

خورونوش کے اس دستور کے پیشِ نظر رانجھا اپنے بھائی کی بہت خدمت کرتا تھا۔

گھنٹوں اس کے سارے جسم کی مالش کرتا، چاند پر دہی، مونچھوں پر گھی، تلووں پر کدو رگڑتا، کانوں میں بادام روغن ڈالتا اور ہر ذریعے سے غذائیت اس میں سرایت کرتا رہتا، مگر نھتو تھا کہ پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کے شاگرد بھی اس کی خدمت کرتے تھے۔ پاؤں دباتے، پنکھا جھلتے اور ہزار خوشامدیں کرتے، اور یہ لنگوٹ باندھے، تکیے سے ٹیک لگائے، ایک ہاتھ سے اپنی مونچھ تھامے اور دوسری میں سنٹی لیے، انھیں کبھی کبھار سبق دے دیتا۔ جہاں کسی سے کوئی غلطی ہوتی، سنٹی اس کے ٹخنوں پر آ رہتی۔ اس میں ایک بات ایسی ضرور تھی جس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا مگر وہ اسے دوسروں سے کچھ ممتاز کرتی تھی۔ شاید وہ ایک قسم کی سمجھ بوجھ تھی جو بوقتِ ضرورت بروئے کار آتی تھی اور نھتو کے سب قائل ہو جاتے تھے۔ اسی کی وجہ سے اس کی تمام بدتمیزیاں لوگ آسانی سے بھول جاتے تھے اور استاد استاد کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کا بہترین مظاہرہ اینہ کے معاملے میں ہوا۔

نھتو کے بینڈ میں ٹرمپٹ سائیں بھولے کا بالکا شماں بجاتا تھا۔ یہ شماں حلوے اور سوغاتیں کھا کر پل رہا تھا اور اس زور سے ٹرمپٹ بجاتا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ جب جوش میں آتا تو اس کی گردن کی رگیں پھول کر ابھر آتیں۔ مالا کے موٹے موٹے موتی گردن میں دھنس جاتے، چہرہ سرخ ہو جاتا، آنکھیں باہر آنے لگتیں، جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو، اور یہ دوہرا ہو ہو جاتا۔ اس پر اس کا استاد نھتو خوش ہو کر کہتا:

"واہ شمے واہ! ٹرمپٹ بجانے کی شرط یہی ہے۔"

شماں اور زور لگا تا حتیٰ کہ معلوم ہوتا کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ سائیں بھولا ایسے موقعوں پر پھولا نہ سماتا۔ اس نے شمے کو ٹرمپٹ بجانا سیکھنے کی ترغیب اس لیے دی تھی کہ خود اسے ناقوس بجانا نہیں آتا تھا اور جب بہت سے ملنگ فقیر لال بادشاہ کی درگاہ پر جمع ہوتے تھے اور بھنگ گھوٹ کر مرشد کو یاد کرنا چاہتے تھے تو ناقوس خلیفہ بھولے کے بجائے کسی عام ملنگ ہی کو بجانا پڑتا تھا۔ سائیں بھولا سوچتا تھا کہ اگر اس کا بالکا ٹھیک سے ٹرمپٹ بجانا سیکھ لے تو آئندہ آسانی رہے گی اور مرشد کی روح بھی خوش رہے گی۔

ڈھول حسّے کے گلے میں پڑتا تھا اور وہ بھی اسے پوری قوت سے پیٹتا تھا۔ حسّا دن بھر لوکو شاپ سے دریا تک جانے والے گندے نالے میں کھڑا رہتا تھا اور طرح طرح کی تین چار چھلنیوں سے نالے کی تہہ سے کائی نکال نکال کر چھانتا تھا۔ کسی چھلنی کے چھید موٹے تھے، کسی کے مہین۔ ایک چھلنی سے بچی کائی دوسری میں ڈال کر اسے نالے کے پانی سے دھوتا تھا اور آخر کار جو بچتا اسے بار بار باریک ترین چھلنی میں ڈالتا اور دھوتا۔ اس کا عمل علی الصباح شروع ہوتا اور سہ پہر تک جاری رہتا۔ سہ پہر کو وہ نالے سے نکل کر کنارے پر بیٹھ جاتا اور پہلے ایک مقناطیس سے اپنی چھلنی کی کائی چھانٹتا۔ اس میں اگر لوہے کی کیل یا پیچ یا ڈھبریاں ہوتیں تو نکل آتیں۔ لوہے کا مال الگ کرنے کے بعد وہ پیتل اور قلعی تلاش کرتا، کوئلے کی ڈلیاں ایک طرف کر لیتا اور اس طرح تین چار دھاتیں اور کوئلے الگ الگ پوٹلیوں میں باندھ کر لنڈے بازار کا رخ کرتا۔ لوہا، پیتل اور سکہ چار پانچ آنے میں بک جاتے، قلعی وہ نور پور کے شیدے قلعی گر کے پاس بیچتا، اور کوئلہ گوبر میں ملا کر اپنے گھر میں جلانے کے لیے دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈال دیتا۔ اس کی

روزانہ آمدنی بارہ چودہ آنے سے کم نہیں تھی — کبھی کبھی ڈیڑھ دو روپے تک بھی پہنچ جاتی تھی۔ شام کو تفریح کے طور پر وہ نتھو کی بیٹھک میں چلا آتا اور گھنٹوں بیٹھا ڈھول پیٹا کرتا۔

بینڈ میں سب سے دلچسپ ساز ایک بہت بڑا دھوتو والا باجہ تھا جسے بیس کہتے ہیں۔ اس پر کوئی دُھن پوری نہیں بجتی بلکہ ایک قسم کے ساتھ کا کام دیتا ہے۔ ہر دھن کے ساتھ یہ باجہ وقتاً فوقتاً 'بھوں بھوں' کر دیتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس 'بھوں بھوں' سے دھن کی صورت بہتر ہو جاتی ہے۔ نتھو کے پاس یہ بیس باجہ نہایت وزنی قسم کا تھا مگر اسے بجانے کے لیے اس نے اپنے بینڈ کے سب سے کم عمر لڑکے کو چنا تھا۔ یہ دھوتو فیکا کمہار بجاتا تھا جس کے لیے اسے محض اٹھا لینا ہی کافی دشوار کام تھا۔ یہ ٹھگنا سا لڑکا جب بیس اٹھا کر چلتا تو اس کا بڑا ابل فیکے کے گھٹنوں سے ٹکراتا اور سارے کا سارا لڑکا اس کے پیچھے چھپا ہوا معلوم ہوتا۔ دور سے یوں نظر آتا کہ ایک دھوتو چلا آ رہا ہے جس کے ایک بل میں ایک لڑکا بیٹھا ہے۔ اس کی طوطی جب فیکا منھ سے لگاتا تو اوپر کا حصہ اس کی ناک پر اور نچلا حصہ ٹھوڑی پر آتا۔ ناک سے نیچے کا سارا چہرہ اس کے اندر چلا جاتا۔ لیکن فیکے کی ہمت تھی کہ کسی نہ کسی طور اس میں سے 'بھوق بھوں' پیدا کر ہی لیتا تھا، اور اگر کبھی دو چار 'بھوں بھوں' ایک ساتھ ہو جاتیں تو نتھو خوش ہو جاتا۔ اس کا چہرہ محبت سے چمک اٹھتا اور وہ کہتا:

''واہ فیکے استاد، واہ! بیس بجانے کی شرط یہی ہے۔''

فیکا اپنی تعریف سن کر دو ایک 'بھوں' اور بجا دیتا۔

نتھو نے بیس بجانے کے لیے فیکے کو کیوں چنا؟ اس پر چوک والوں میں اتفاقِ

رائے نہیں تھا۔کوئی کہتا تھا کہ خود فیکے کے لیے، کوئی سمجھتا تھا کہ نتھو کو فیکے کی گالیاں پسند ہیں اور اکثریت کہتی تھی کہ نتھو نے فیکے کو اس کی بہن امینہ کی خاطر بینڈ میں شامل کیا ہے۔ فیکا منھ چٹ لگتا گورا چٹا لڑکا تھا۔ جس روز نہا دھو کر اچھے کپڑے پہنتا اور اس کی ماں اس کی آنکھوں میں سرمہ لگا دیتی، تمام چوک والے اسے پان کھلاتے اور نورا برفی بھی کھلاتا۔ ویسے دن بھر وہ ایک گدھی پر برتن لادے شہر کے چکر لگاتا تھا اور گلی گلی صراحیاں، چلم، پیالے وغیرہ بیچتا پھرتا تھا۔ گھومتے پھرتے اس نے طرح طرح کی پُر تکلف مغلظات نوکِ زبان کر لی تھیں جنھیں وہ بے تکان استعمال کرتا تھا۔ جب وہ ڈھائی ڈھائی من کی گالیاں لڑیوں میں پرو کر دائیں بائیں بکھیرتا تو نتھو کو جیسے گدگدی ہونے لگتی۔ وہ اپنے شانے ہلا ہلا کر ہلکی ہلکی ہنسی ہنستا اور بار بار کہتا:

''واہ فیکے استاد، واہ! گالی دینے کی شرط یہی ہے۔''

فیکا شرما جاتا، اس کے گال سرخ ہو جاتے اور آنکھیں نیچی کر کے کہتا:

''استاد، تم کو تو گالی نہیں دی میں نے۔ میں تو اس...''

نتھو اس کے شرمانے پر بچھ بچھ جاتا اور اس کے شانے پر بازو رکھ کر اس کے گال پر ہاتھ پھیرتا، اسے اپنی بیٹھک پر لے جاتا۔ چوک والے کھڑے مسکراتے دیکھتے رہتے۔ اس کے باوجود چوک والوں کی اکثریت کی رائے یہی تھی کہ نتھو نے فیکے کو اس لیے بینڈ میں رکھا ہے کہ اس سے امینہ کی بُو آتی ہے۔ پھر امینہ اکثر فیکے کو گھر بلانے کے لیے نتھو کی بیٹھک پر بھی جاتی تھی اور نتھو اسے دیکھ کر مونچھوں کو تاؤ دیتا، اس سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے امینہ کی آواز بہت پیاری لگتی ہے۔ یہ تو خیر کہنے کی

بات تھی۔ امینہ کے حسن و جمال کی دھوم نور پور سے دوسری نواحی بستیوں میں اور خود شہر تک پہنچ چکی تھی اور ہر روز کئی اجنبی نور پور میں گھومتے پھرتے نظر آتے تو محض اس لیے کہ امینہ یہاں رہتی تھی۔ کوئی بسّے کمہار کے آوے کا پتا اس لیے پوچھتا کہ اس سے اچھی چلم کوئی نہیں بناتا اور کوئی اس لیے کہ اس کی بنائی ہوئی صراحی میں پانی جتنا ٹھنڈا ہوتا ہے، اَور کسی کمہار کی صراحی میں نہیں ہوتا۔ مقصد سب کا ایک ہی ہوتا کہ کسی صورت امینہ سے ایک آدھ بات ہو جائے، اس کا لمس نصیب ہو جائے، اور ہاتھ آ جائے تو کیا کہنا ہے۔ امینہ کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ وہ آدمی کی صورت دیکھ کر، اس کے تکنے کا انداز دیکھ کر جان لیتی کہ معاملہ کیا ہے۔ اس کی مقبولیت نے اسے حق دے دیا تھا کہ وہ مٹک مٹک کر چلے، چلنے میں کولھوں کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے اور پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر اٹھائے۔ بازار میں گزرتے ہوئے بغیر پیچھے دیکھے اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ کون اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے اور کیوں۔ اگر کوئی اجنبی ہوتا تو اسے ایک بار مڑ کر دیکھنا پڑتا کہ کیسا ہے۔ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تول کر گردن کو ایک جھٹکا دیتی، چال دھیمی کر لیتی، رک جاتی یا پلٹ کر واپس آنے لگتی۔ اگر دیکھتی کہ اجنبی جی دار ہے، بدک نہیں اٹھا، ڈر کے مارے اس کی سانس نہیں پھول گئی، تو اسے اَور آزمائش میں ڈالتی۔ بے ساختہ قہقہے لگاتی، اسے زِچ کرنے کے دوسرے حربے استعمال کرتی، خود رک کر اپنے گھر کا پتا اس سے پوچھ لیتی۔ اگر وہ پھر بھی نہ ٹلتا، بے باک یا ہٹ دھرم واقع ہوتا، صاف ”ہائے صدقے“ چلّانے لگتا یا اپنی موت کا اعلان کر دیتا تو امینہ کا چہرہ غرور سے چمک اٹھتا۔ لطف سے لبالب بھری مسکراہٹ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر بکھر جاتی۔ کولھے اَور جھٹکے کھاتے، پاؤں

اور گھسٹنے لگتے، چال مدھم پڑ جاتی اور اس کا رواں رواں صدقے جانے والے کو دعوت دیتا کہ ہمت ہے تو آگے بڑھو اور مجھے اٹھا کر لے چلو۔ اگر ہمت نہیں تو جاؤ، مسکین کتوں سے مجھے نفرت ہے۔

امینہ کا پیچھا کرنے والا مسکین ترین کتا پرائمری اسکول کا ماسٹر بیچارہ عبدالغفور تھا۔ ہر شام امینہ کی ایک جھلک کی خاطر دو تین میل کا سفر طے کر کے آتا تھا اور اکثر چوک والوں کو گھڑی دو گھڑی اپنا تماشا دکھا جاتا تھا۔ اس کا اسکول نور پور کے بورڈ کے قریب بی بی کے احاطے سے ملحق تھا۔ خود وہ بی بی کے احاطے کی ایک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ یہاں سے کمہاروں کے احاطے کو جانے کے لیے پہلے ٹھنڈی سڑک سے چوک نور پور آنا پڑتا تھا اور پھر عزیز روڈ پر مڑ کر اس کے سرے تک چلنا پڑتا تھا۔ اول تو یہ راستہ بہت لمبا تھا، دوسرے بیچارہ ماسٹر عبدالغفور چوک والوں کی چبھتی نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا، اس لیے بی بی کے احاطے سے کمہاروں کے احاطے کی طرف منہ کر کے چل پڑتا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ کیچڑ ہوتا، کہیں مکانوں کے گرد ہو کر جانا پڑتا، کہیں نالیاں پار کرنا پڑتیں، کتے الگ تنگ کرتے اور چھوٹے بچے پیچھے لگ جاتے، مگر بیچارہ ماسٹر عبدالغفور، اپنے جنون کی پکار پر کان دھرے، چلتا چلتا کمہاروں کے احاطے تک پہنچ ہی جاتا۔ احاطے کا پھاٹک چوبیس گھنٹے اور بارہ مہینے کھلا رہتا تھا — اسے بند کرنے کا کوئی انتظام سرے سے تھا ہی نہیں — مگر ماسٹر کو تو اس سے غرض جب ہوتی کہ اندر جانے کی ہمت بھی اسے خدا نے دے دی ہوتی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑاتا کہ اسے یہاں کھڑے کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اگر اطمینان ہو جاتا کہ اس کی چوری پکڑی نہیں گئی تو وہ

دیوار پر دونوں ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سر اٹھاتا اور دیوار کی سطح تک اپنی آنکھیں لا کر احاطے کا جائزہ لیتا۔ اگر امینہ کہیں آوے پر برتن چُنتی، مٹی گوندھتی یا ٹکڑی پر بیٹھی نظر آ جاتی تو ماسٹر عبدالغفور دیوار سے لٹکے لٹکے اسے تکتا رہتا۔ جب تک اس کے بازوؤں کی قوت جواب نہ دیتی یا امینہ سر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھ لیتی اور پھر اپنے قہقہے کی چابکوں سے اسے پیٹ پیٹ کر بے حال نہ کر دیتی، ماسٹر بیچارہ لٹکا رہتا۔

اگر امینہ ماسٹر عبدالغفور کو احاطے میں نظر نہ آتی تو کچھ دیر لٹکنے کے بعد ماسٹر کو مجبوراً احاطے کے اندر جانا پڑتا۔ بسّے کمہار کی کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچتے ہی اس کی سانس تیز تیز چلنے لگتی۔ وہ رک کر اور کھانس کھونس کر کچھ اسے درست کرتا اور کچھ خشک گلے سے آواز نکالنے کی ہمت پیدا کرتا اور بے تحاشا چلا اٹھتا: ''میاں بسا صاحب ہیں؟'' بیچارے ماسٹر سے اپنی آواز پہچانی تک نہ جاتی مگر بسا اور امینہ اسے خوب پہچاننے لگے تھے۔ اگر بسا کہیں امینہ سے کہہ دیتا کہ ''دیکھنا بیٹا، باہر ماسٹر جی آئے ہیں،'' تو ماسٹر کے اوسان خطا ہو جاتے۔ وہ جانتا تھا کہ امینہ باہر آ کر ماسٹر کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جائے گی۔ اس خوفناک امکان سے ماسٹر کا رنگ فق ہو جاتا۔ امینہ آ کر ماسٹر کا پھانک سا کھلا منہ دیکھتی تو بے اختیار قہقہے لگاتی اور ماسٹر کا بازو ایسے تھام لیتی جیسے کسی اندھے کو راستہ دکھانے لگی ہے۔ ماسٹر تھر تھر کانپنے لگتا۔ وہ اور بے باکی سے کہتی، ''آؤ ماسٹر جی! اندر آؤ نا!'' امینہ کے گرم گرم ہاتھ ماسٹر کو جھلس دیتے، اس کی تمام قوتیں سلب کر کے وہ حالت کر دیتے جو مسمریزم کے عمل میں عامل معمول کی صورت بنا دیتا ہے۔ ماسٹر ہوا میں دیکھتا، بے جانے بوجھے قدم اٹھاتا کوٹھڑی میں داخل ہوتا اور جونہی امینہ اس کا بازو چھوڑتی، وہ بیہوش ہو کر

چارپائی پر دھم سے گرتا اور پکارتا: ''پانی! پانی!''

''تھک گئے ہو ماسٹر جی؟'' بستا کہتا اور امینہ پانی لے آتی۔ ماسٹر گھونٹ دو گھونٹ پیتا اور باقی اپنے کپڑوں پر، چارپائی پر، اپنی گردن پر گراتا اور ایسے بولنے لگتا جیسے اس نے ایک سبق یاد کیا تھا جواَب دہرا رہا ہے۔

''سرکار نے مفت تعلیم کا بندوبست کیا ہے کیونکہ علم بڑی دولت ہے۔ فیکے کو مدرسے میں آنا چاہیے۔ وہ گدھی کے پیچھے پیچھے گلی گلی پھرتا ہے اور گالی بکتا ہے اور نتھو میراثی کی بیٹھک پر جاتا ہے اور امینہ اسے بلانے وہاں جاتی ہے اور پانی... اور سرکار جرمانہ کر دیتی ہے اور فیکے کو میرے پاس آنا چاہیے...''

دراصل ماسٹر بات کرتے کرتے اوپر دیکھتا تو امینہ نظر آتی اور اس کے نظر آتے ہی ماسٹر کے ذہن میں تمام باتیں گڈمڈ ہو جاتیں؛ اسے بڑی کوشش سے انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑتا، مگر امینہ کی مسکراہٹ ماسٹر کی ہمت کی ایک نہ چلنے دیتی۔ بستا دیکھتا کہ معاملہ بہت گڑبڑ ہو رہا ہے تو ڈانٹ کر امینہ کو کوٹھڑی سے باہر بھیج دیتا۔ ''کم ذات! تجھے کیا پتا ان باتوں کا؟ جا کام کر۔'' اور پھر ماسٹر سے کہتا، ''ماسٹر جی! ہمارے باپ دادا نے نہ پڑھا تو یہ کیا پڑھے گا۔ اپنا کام ہی سیکھ لے تو بہت ہے۔ روٹی تو کما کھائے گا۔''

''میں کہتا ہوں میاں بستا! ایسے لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ تم اسے بھیجو، میں خود پڑھاؤں گا۔''

ماسٹر عبدالغفور مڈل پاس تھا اور دسویں کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اپنے خیال میں دیکھتا کہ فیکا اس کے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے اور امینہ روٹی پکا رہی ہے، مگر بستا کہہ دیتا:

"ماسٹر جی! ہم لوگوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

باہر کسی سے بات کرتے امینہ کی آواز ماسٹر کے کان میں آتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ہزاروں چاندی کی گھنٹیاں ایک ساتھ بج رہی ہیں۔ اس کا ذہن دھندلا جاتا اور اکثر بغیر اجازت لیے، بغیر سلام دعا لیے دیے، وہ اٹھتا اور اپنے احاطے کی طرف ایسے چلنے لگتا جیسے وہ کٹھ پتلی ہو اور تماشا کرنے والا اسے چلانے کے تار بڑی تیزی سے جھٹک جھٹک اسے چلا رہا ہو۔ اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر معلوم نہیں کیوں وہ گھنٹوں بچوں کی طرح بلبلا کر روتا اور اکثر روتے روتے سو جاتا۔

ماسٹر عبدالغفور پر مصیبت کے پہاڑ اُس روز ٹوٹتے جب امینہ نہ تو اسے احاطے میں نظر آتی نہ کوٹھڑی کے اندر پائی جاتی بلکہ چوک میں مائی خیری سے چنے بُھنوانے گئی ہوتی۔ ماسٹر چاہتا تھا کہ ایسے حالات پیدا ہوں کہ وہ تو امینہ کو دیکھتا رہے مگر نہ امینہ اسے دیکھے اور نہ امینہ کو دیکھتے ہوئے کوئی اسے دیکھے۔ اس لیے ماسٹر کی زندگی میں بہترین دن وہی ہوتا جب وہ احاطے کی دیوار سے لٹکا امینہ کو گھڑی دو گھڑی دیکھ کر اپنی کوٹھڑی میں واپس آجاتا اور اس کے سپنے اسے من مانی لذتیں بہم پہنچاتے رہتے۔ امینہ سے کوٹھڑی کے اندر ملاقات اور خصوصاً اسے چھو جانے سے ماسٹر کی ذہنی کائنات میں ایسی آگ لگتی کہ پہروں رونے سے نہ بجھتی۔ لیکن جس روز ماسٹر عبدالغفور کو امینہ کے پیچھے چوک میں جانا پڑتا اس روز تو قیامت ہی برپا ہو جاتی اور ماسٹر کو قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے وعدہ کرنا پڑتا کہ آئندہ کبھی امینہ کو دیکھنے کی غرض سے گھر کے باہر قدم نہیں رکھے گا۔

مائی خیری کی بھٹی چوک کے بالکل قریب، نور پور کی ٹھنڈی سڑک کے کنارے

تھی۔ پہلے یہاں چار بانسوں کے سہارے صرف ایک چھپّر تھا جس کے نیچے مائی خیری
دن بھر بیٹھی چنے بھونا کرتی تھی، مگر جب نور پور کی سڑکیں بننے کا واقعہ ظہور پذیر ہوا تو آٹھ
پختہ ستون اور ان پر چھت پڑ گئی۔ اب مائی خیری کو ہر آتے جاتے کو تنبیہ نہیں کرنا پڑتی تھی
کہ اگر بانس کے سہارے کھڑے ہوئے تو چھپر سر پر آ رہے گا۔ یہاں ہر سہ پہر کو اور
خصوصاً برسات اور سردیوں کے موسم میں بہت رونق رہتی تھی۔ بھیگی بھیگی خنک فضا میں
بھنے ہوئے چنے اور مکئی کی میٹھی میٹھی خوشبو سے ہر راہگیر کے منھ میں پانی بھر آتا تھا اور
بڑے بڑے معتبر لوگ بھی گرم گرم چنے کھانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ نور پور کے بچوں کا
تو خیر یہ روز کا دستور تھا کہ سہ پہر کو کوئی مکئی لینے چلا آ رہا ہے، کوئی چنا، کوئی چاول اور کوئی
گندم۔ نئی فصل کی گندم میں گڑ ملا کر نہایت لذیذ کھیل بنتی ہے اور نئے چاول پھول کر
اتنے لذیذ ہو جاتے ہیں کہ دال یا مکئی ان کے مقابلے میں کوئی شے نہیں رہتی۔ مائی خیری
بچوں سے اناج کی بھنوائی ایک چوتھائی لیتی تھی اور پھر اسے نقدی میں بیچ کر اچھے خاصے
پیسے کما لیتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کئی گھروں کا کام بھی کرتی تھی — حنیف پہلوان، بابو
کرم داد، ماسٹر طالع مند وغیرہ کے گھروں کا سودا سلف لا کر دیتی تھی اور میونسپلٹی کے
منظور شدہ ٹم ٹم سے سفر کرنے والے اور جمعرات جمعے کو وسمہ مہندی لگانے والے بزرگوار
مائی خیری کی مستعدی، محنت اور ہمت کے اس قدر قائل تھے کہ انھیں جب موقع ملتا، خود
اس کی بھٹی سے چنے خریدنے آتے تھے۔ مائی خیری بھی ان کو چنے دیتے ہوئے سارا
ڈوپٹہ اس طرح سر پر لے لیتی تھی کہ باقی جسم ڈھانپنے کے لیے کچھ نہ بچتا تھا۔ یہ حضرات
بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھتے۔ کم از کم مائی خیری کی گردن سے اوپر نہیں دیکھتے تھے۔ وہ مائی

خیری کی جڑوں سے واقف تھے تو مائی خیری بھی ان کے گھروں میں جاتی تھی۔ ایک شخص ایسا نہیں تھا جس کے گھریلو معاملات اس سے چھپے ہوں۔ ان کی بہو بیٹیوں کے وہ کام جو وہ کسی اَور کی معرفت نہیں کروا سکتی تھیں، مائی خیری ہی تو کرتی تھی۔ چھوٹی بیبیوں کے لیے لپ سٹک اور پاوڈر، بڑی بیبیوں کے لیے بال صفا پاوڈر اور فتنہ بہوؤں کے لیے نشان والے ازار بند جو ململ کے کُرتوں سے دو سڈول ٹانگوں کے درمیان تکونی جھالروں کی طرح لٹکتے ہوئے کلاک کے لٹکن کی طرح ہلتے رہتے تھے۔ طرح طرح کے پراندے اور کنگھی، تیل، عطر، پھلیل، فلمی کہانیوں کی کتابیں اور جاسوسی ناول، یہ سب کچھ مائی خیری کی معرفت آتا تھا۔ وہ ان تمام چیزوں کے استعمال سے بھی بخوبی واقف تھی اور ہر ایک سے پورا فائدہ اٹھانے کے ڈھنگ جانتی تھی۔ اسے درجنوں ایسے نسخے بھی یاد تھے جو بوقتِ ضرورت بدقسمتی دور کرنے کے لیے خواتین کو استعمال کرنے پڑتے ہیں، اور ان کی شرفا کے گھروں میں بڑی قدر تھی۔ حکیم، ڈاکٹر یا دائی یا ہیلتھ وِزیٹر کنواری لڑکیوں کے لیے بلائے جائیں تو سارا جہان انگشت نمائی کرتا ہے مگر مائی خیری کی آمد و رفت پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو محض مَیلے برتن مانجھنے یا جھاڑو لگانے آتی تھی۔ گھر سے باہر بھی وہ بچیوں کی خبر گیری رکھتی تھی۔

''سر ڈھانپ اپنا مُردار!'' وہ چلّاتی اور چنے بھنوانے والی بچپن سے جوانی میں قدم رکھتی لڑکی کانپ اٹھتی۔ ''ہر ایک سے ہاتھا پائی کرتے تجھے شرم نہیں آتی؟ اب تو بچّی نہیں!'' ہر ایک کو یہی خوف رہتا کہ کہیں مائی خیری وہ فقرہ نہ کہہ دے جس سے بڑا عذاب ان کے لیے دنیا میں کوئی نہیں تھا کہ ''کہوں گی تیری امّی سے۔''

مائی خیری کو امینہ سے خاص لگاؤ تھا۔ اسے اس کی پیدائش بھی یاد تھی۔ خیری کے لیے بابو عبدالعزیز کا تانگہ آیا تھا اور وہ گینڈے کو امینہ کی ماں کے پاس سُلا کر اپنے کاروبار پر چلی گئی تھی۔ علی الصباح لوٹی تو امینہ وارد ہونے والی تھی۔ امینہ کا ناڑو اسی نے کاٹا تھا۔ پھر امینہ مائی خیری کے ہاتھوں میں پلی، ننھی بچی سے لڑکی اور اب لڑکی سے جوان ہو گئی تھی۔ ہر قدم پر مائی خیری کی نصیحتیں اس کے شامل حال رہیں۔ اسی نے امینہ کو بتایا تھا کہ خدا ایسا چاند سا مکھڑا دے تو پاؤں کا بھی دھیان رکھنا چاہیے۔ جوتا نہ پہنا جائے تو پاؤں بالکل گائے کے کُھر بن جاتے ہیں۔ کنگھی پٹی کرنا بھی مائی خیری نے سکھلایا تھا، اور اب تک یہ دیکھنے میں آتا تھا کہ امینہ بھٹی پر مائی خیری کے برابر بیٹھی ہے، اس کی مدد کر رہی ہے، بھٹی میں آہستہ آہستہ سوکھے پتے جھونک رہی ہے یا کڑاہی میں بھنتے چنوں پر گڑوی رگڑ کر چنوں کی دال بنا رہی ہے۔ ساتھ میٹھی میٹھی باتیں بھی ہو رہی ہیں کہ کسی بات پر امینہ جھینپی اور بالکل دوہری ہو گئی۔ مائی خیری نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ایک چٹکی بھری اور پھر اپنے نیفے یا گریبان کے اندر سے کوئی چھوٹی سی پُڑیا یا ننھی سی بوتل کاغذ میں لپٹی ہوئی نکالی اور امینہ کو تھما دی۔ امینہ نے جھپٹ کر لے لی اور اسے اپنے نیفے یا گریبان کے اندر چھپا لیا اور گھر لوٹتے ہوئے راستے بھر اسے ٹٹولتی رہی۔

کچھ دستور ایسا بن گیا تھا کہ چوک والے امینہ کو مائی خیری کے پاس بیٹھا دیکھتے تو قطاریں باندھ کر دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھ جاتے اور ماسٹر عبدالغفور کا انتظار کرنے لگتے۔ جونہی وہ کمہاروں کے احاطے سے مایوس ہو کر چوک کا رخ کرتا، کسی بے تار برقی کے ذریعے چوک میں خبر پہنچ جاتی کہ ماسٹر آ رہا ہے، اور ماسٹر کو ان کی نگاہوں کی آوازیں آ آ

کر جھنجھلاہٹ دینے لگتیں۔ ماسٹر دائیں بائیں دیکھتا مگر کسی کی نگاہ سے نگاہ ملتی تو دوسرا شخص منہ ایسے پھیرتا جیسے ماسٹر کو بتانا چاہتا ہو کہ وہ اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا۔ ماسٹر بھنّا اٹھتا۔ اُدھر مائی خیری بھی اس کے انتظار میں بار بار سڑک پر دیکھتی۔ ماسٹر نظر آتا تو مسکرا کر ایسے امینہ کو تکتی کہ امینہ کو ماسٹر کی آمد کی خبر مل جاتی۔

''آؤ ماسٹر جی۔ آج آپ کا جی بھی اِدھر آنے کو چاہا ہے، شکر ہے۔'' ماسٹر یہ سنتے ہی بوکھلا جاتا۔ راستے بھر اپنی مٹھی میں پیسے دو پیسے بڑی مضبوطی سے تھامے آتا تھا کہ پیسے کہیں بھاگ نہ جائیں مگر جب انھیں جیب سے نکالنا چاہتا تو وہ غائب ہو جاتے۔ پسینے سے بھیگا ہاتھ جیب میں ایسے چلنے لگتا جیسے کوئی ہنڈیا میں کفگیر پھیر رہا ہو۔ ان پیسوں کو بھی ماسٹر سے دشمنی تھی، ایسے گم ہوتے کہ جیب میں تانبے کی کسیلی بُو کے سوا ماسٹر کو کچھ نہ ملتا۔ وہ چاروں طرف دیکھتا کہ سڑک پر نہ گر گئے ہوں مگر چوک والوں کی نگاہیں راستے میں حائل ہوتیں اور اسے کچھ نہ ملتا۔ پھر کسی ترکیب سے یہ ہوتا کہ پیسے اس کی جیب سے اچھل کر مائی خیری کی طرف بڑھتے مگر اس کی ہتھیلی کا مقام صحیح طور پر مقرر نہ کر پاتے اور یا تو چنوں کے تسلے میں گر جاتے یا بھٹی کی آگ کی نذر ہو جاتے۔ امینہ اچھل کر پوری کوشش کرتی کہ ان کو تھام لے مگر جب مائی خیری ایک غلیظ مسکراہٹ سے کہتی، ''ہائے میں مر گئی، بڑا درد ہے امینہ کو ماسٹر کے پیسے کا!'' تو امینہ شرما کر رک جاتی اور پھر کھوکھلے قہقہے لگانے لگتی۔

''بڑے گھبرائے رہتے ہو ماسٹر جی! خیر تو ہے؟'' مائی خیری پوچھتی اور خواہ مخواہ ماسٹر بیچارے کو چھیڑتی۔

''دو پیسے کے چنے دو!'' ماسٹر چلّاتا۔

عام بچے بالے بھٹی کے کاروبار میں اس رکاوٹ سے بے صبرے ہو جاتے اور ہر ایک چلاتا کہ "میرے چنے!" "میری دال!" "میری مکئی!"

"ارے صبر کرو،" مائی خیری کہتی اور پھر ماسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولتی، "بے صبری سے ہنڈیا کبھی پکی ہے؟ کیوں ماسٹر جی؟"

بچے پھر چلاتے۔ مائی خیری ماسٹر سے پوچھتی، "اپنی باری سے لو گے ماسٹر جی یا سب سے پہلے؟" اور پھر خود ہی جواب بھی دیتی، "آپ کا تو حق پہلا ہے نا۔ اتنا سفر کر کے آتے ہو۔"

اس پر مائی خیری اور امینہ ایک دوسرے سے لپٹ کر ہنسنے لگتیں اور امینہ ایسا منہ بناتی جیسے اس کا مزہ خراب ہو گیا ہو۔

ماسٹر اپنا میلا رومال بچھاتا اور ابھی مائی خیری ترازو کے پلڑے سے دانے رومال میں ڈالنے ہی لگتی کہ وہ رومال کا کونا پکڑ کر اٹھانے لگتا۔ پھر اس غلطی کی گھبراہٹ دور کرنے کے لیے باقی چنے بھی گراتا، سر پر پاؤں رکھ کر اپنے احاطے کا رخ کرتا۔ اِدھر کسی سے ٹکراتا، اُدھر کسی سے بھڑتا، جیسے ہر شخص اس کے راستے میں کھڑا اسے گرانے کی کوشش کر رہا ہو، اور گرتے پڑتے کسی نہ کسی صورت اپنی کوٹھڑی میں آ گرتا۔ چوک والوں کی نگاہوں اور امینہ اور مائی خیری کی ظالم حرکتوں سے چھلنی سینہ رونے کی خواہش کو دبا نہ سکتا اور ماسٹر بین کرتا اپنے دل سے وعدہ کرتا کہ آئندہ اس فاحشہ کی بھٹی پر کبھی نہیں جائے گا۔

یہ الگ بات ہے کہ اگلے ہی روز ماسٹر کے قدم خود بخود کمہاروں کے احاطے کی طرف پھر اٹھنے لگتے۔

نھو کے بینڈ میں ایک شخصیت اُور تھی۔ نام تھا بلہڑ بھشتی۔ یہ رُلدو بھشتی کا بیٹا تھا۔ بدقسمتی سے بچپن میں کوٹھے سے گر گیا تھا اور سر کے بل گرنے سے کئی روز تک بیہوش پڑا رہا۔ جب ہوش میں آیا تو اس کے ہوش حواس بگڑ چکے تھے۔ اوپر کا ہونٹ کٹ کر الگ ہو گیا تھا، جسے اسپتال والوں نے پھرسی کر ناک کے نیچے ایسے جوڑ دیا کہ وہ گوشت کا ایک بڑا سا گولہ بن گیا اور اب اس کی رعایت سے اسے بلہڑ کہتے تھے۔ ہوش حواس کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے میں کوئی غیر معمولی بات اس میں نظر نہیں آتی تھی، مگر جہاں یہ کوئی عمل شروع کر دیتا، یہ اسے کیے ہی چلا جاتا۔ مثلاً رُلدو نے اسے اپنے ساتھ کام پر لگایا۔ ایک نئی مشک خرید کر اس کے کاندھے پر رکھی اور اپنے ہمراہ اسے لے کر چلا۔ رلدو ایک مکان کے اندر چلا گیا اور بلہڑ سے اتنا کہنا بھول گیا کہ باہر ٹھہرے، مشک خالی کر کے مکان سے باہر آیا تو بلہڑ غائب تھا۔ اِدھر بھاگ، اُدھر دوڑ، سارے چوک والے دن بھر بلہڑ کو ڈھونڈتے رہے مگر کوئی پتا نہ ملا۔ سب تھک کر ہار بیٹھے۔ اگلے روز صبح صبح کیا دیکھتے ہیں کہ بلہڑ بدستور بھری ہوئی مشک کندھے پر اٹھائے چلا آرہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رلدو تو مکان کے اندر چلا گیا تھا مگر بلہڑ سیدھا چلتا رہا تھا اور چلتے چلتے بادامی باغ پہنچ گیا تھا۔ وہاں آدھی رات کے وقت کسی نے اسے دیکھا جو اسے خوب جانتا تھا۔ اس نے بلہڑ کا منھ اس کے گھر کی طرف موڑ دیا اور یہ بدستور چوبیس گھنٹے چلتا رہا حتیٰ کہ گھر واپس آ گیا۔ اسی وقت رلدو نے فیصلہ کر لیا کہ یہ بلہڑ دنیا میں کسی کام کے لائق نہیں اور اگر اس کی کوئی جگہ ہے تو نھو کے بینڈ میں۔ اِدھر نھو کو بلہڑ پر بڑا ترس آتا تھا۔ اس نے بڑے غور وخوض کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر رلدو بلہڑ کو دو تھالیاں خرید دے (جنھیں سیمبل کہتے ہیں) تو نھو بلہڑ کی تربیت کا انتظام

کرلے گا۔ رلدو اور کیا چاہتا تھا، اس نے اگلے ہی روز لنڈے بازار سے تھالیاں لا کر بلبڑ کے حوالے کیں اور آٹھ آنے کے لڈو لے کر بلبڑ کو نھو کا شاگرد کروا دیا۔

بلبڑ بھشتی کی جگہ حسّے ڈھول والے کے عین پیچھے قرار پائی تا کہ اگر بینڈ چلتے چلتے تھمے تو بلبڑ حسّے سے ٹکرائے اور رک جائے۔ اس کے پیچھے فیکا رہتا تھا کہ جب بینڈ مارچ کرنا شروع کرے تو دھوتُو بلبڑ کو دھکیلے اور وہ چلنے لگے۔ جب بینڈ خاکروبوں کی شادیوں میں جاتا یا کبھی نور پور کے ہیجڑے اسے اپنے ہمراہ ایسے گھر لے جاتے جہاں لڑکا پیدا ہوا ہو، تو نھو بلبڑ کو پکڑ کر اسے اس کی مقررہ جگہ پر کھڑا کر دیتا اور ''ایک دو تین'' پکار کر بلبڑ کے دونوں بازو ایک مرتبہ اوپر نیچے ہلا دیتا۔ اِدھر بینڈ بجنا شروع ہوتا، اُدھر بلبڑ اپنی چھنا چھن شروع کر دیتا۔ پھر فیکا اسے دھکیلتا اور بینڈ مارچ کرنے لگتا۔ اسی طرح جب باجہ روکنا ہوتا اور نھو ''ہالٹ'' پکارتا تو بلبڑ حسّے ڈھول والے سے ٹکرا کر رک جاتا مگر اس کے بازو اپنی چھنا چھن میں بدستور مصروف رہتے۔ نھو آتا اور اس کے بازو پکڑ کر ایک تھالی کا منھ دوسری سے جوڑ دیتا اور اس طرح بلبڑ دونوں تھالیاں جوڑے رکا کھڑا رہتا۔

مائی خیری کو بلبڑ سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اسے کچھ ولی قسم کا آدمی سمجھتی تھی۔ اکثر اسے مہر جیون کے احاطے میں اپنی کوٹھڑی کے اندر لے جاتی اور اس سے عجیب و غریب سوال پوچھتی۔ یہ ''ہوں ہاں'' کر دیتا اور جو کھانے کو ملتا کھا لیتا۔ مائی خیری اس کی ''ہوں ہاں'' کا کچھ نہ کچھ مطلب بھی نکال لیتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے بلبڑ کی ولایت کے ذریعے کاروبار کرنے کی بھی سوچی۔ وہ اسے اپنے ہمراہ شرفا کے گھروں میں لے جاتی۔ سب لڑکیاں بیبیاں اردگرد جمع ہو جاتیں۔ اس کی بڑی خاطر مدارات ہوتی۔ اچھی اچھی

چیزیں کھانے کو ملتیں اور پھر بیبیاں اپنے دلوں کی باتیں پوچھتیں۔ اکثر باتیں سن کر وہ ہنس دیتا۔ کبھی کبھار گالی بھی دے دیتا۔ اس کی ان حرکتوں کے خفیہ اور صحیح مطالب بیان کرنا مائی خیری کا کام تھا۔ وہ علیحدگی میں بیبیوں سے بات کرتی اور چار پیسے بھی بٹور لیتی۔ رلدو کو یہ حرکت بالکل پسند نہ آئی۔ اس کے گلے میں رنگ برنگے دھاگوں کی اٹیاں اور مُنڈا سر اور سبز لمبی قمیض رلدو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے مائی خیری کو ڈانٹ کر منع کیا کہ وہ بلہڑ کا پیچھا چھوڑ دے۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی اسے یہ تھی کہ مائی خیری کا بیٹا گینڈا جہاں بلہڑ کو اپنی کوٹھڑی میں دیکھ پاتا، اسے سینے سے لگا کر اس قدر زور سے بھینچتا کہ مائی خیری اسے نہ چھڑاتی تو شاید گینڈا اسے جان سے بھی مار ڈالتا۔

3

دیکھنے میں گینڈا باقی لوگوں سے خاص طور پر مختلف نہیں تھا۔ باقی چوک والے کون سے پریزاد تھے کہ گینڈے کے اُبھرے دانت، مُندی آنکھیں، بے ڈھب جسم اور اوٹ پٹانگ اعضا مضحکہ خیز یا حیرت انگیز معلوم ہوتے۔ سارے نورپور میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کے تمام اعضا مناسب، سالم اور متناسب ہوں۔ کسی کے بچپن کے فاقے اور کسی کے حادثے اس کی صورت پر لکھے تھے۔ نَھو ماتا سے کانا ہوا تھا۔ سائیں بھولا دیوار کے نیچے دب گیا تھا اور اب اس کا ایک بازو دوسرے سے ہاتھ بھر چھوٹا تھا۔ بلبڑ تو خیر بہت ہی مصیبت زدہ تھا، ورنہ اِس کی ٹانگیں رکٹ سے کمانی ہوگئی ہیں اور اب پہلوانوں اور شاہسواروں کی طرح ڈولتا ہوا چلتا ہے تو اُس کے کولھوں کی ہڈیاں دق کا شکار ہیں؛ کوئی تپ محرقہ سے ہلکان ہوگیا تھا اور کسی کو کالی کھانسی چپت لگا گئی تھی۔ ان میں گینڈا اپنی تمام خصوصیات کے باوجود کوئی غیر معمولی قسم کا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ باقی اگر گینڈے کی ایک رگ ایسی تھی جو اَور کسی میں نہیں تھی تو چوک کے ہر فرد کی ایک نہ ایک رگ باقی سب سے الگ تھی۔ ایک بھی ایسا نہیں تھا جس کی انفرادیت پر کسی دوسرے کا گمان ہو۔ فرق اتنا تھا کہ گینڈے کی انفرادیت میں ایک خوفناک پہلو بھی تھا۔

گینڈے کی یہ کمزوری تھی کہ جہاں کوئی شخص کسی وجہ سے، کسی حادثے سے یا

بے سوچے سمجھے، اس کے سینے سے چھو جاتا، گینڈا ایک ایسی مشین میں تبدیل ہو جاتا جس کا بٹن دبتے ہی چند ایک واضح اور جانی بوجھی حرکات ایک تسلسل سے عمل میں آنے لگتیں۔ گینڈے کا مشینی عمل کچھ اس طرح شروع ہوتا کہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک نظر آتی، منہ حقارت سے بگڑ جاتا، دونوں بازو اٹھتے اور اس بدقسمت شخص کے سینے کے گرد جو گینڈے کے سینے سے چھو گیا ہوتا، ایک آہنی حلقہ بنا لیتے۔ یہ حلقہ زنبور کے دہانے کی طرح اور کوئی دس گھوڑوں کی طاقت سے تنگ ہونا شروع ہو جاتا۔ کوئی اسے پیٹتا رہے، مکّے پر مکّے لگاتا رہے، طمانچوں سے اس کا منہ لال کر دے، گینڈے پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور اس کے بازو بے نیازی سے اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر اور اپنے حلقے کو تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جاتے تھے، حتیٰ کہ گرفت میں آئے ہوئے شخص کی پسلیاں چرچرانے لگتیں، درد وکرب سے اس کی زبان بالشت بھر باہر نکل آتی، آنکھیں آسمان کی طرف لگ جاتیں اور گردن ایسے ایک طرف گر جاتی جیسے حلال کیے ہوئے مرغ کی ہوتی ہے۔ جب یہ منزل آ جاتی تو گینڈے کی گرفت یکدم ڈھیلی پڑ جاتی۔ یہ اپنے شکار کے منہ پر تھوکتا اور اسے یوں گرنے دیتا جیسے گدھے کی پشت سے مٹی کا بورا گرتا ہے۔ پھر خود پلٹ کر اپنی کوٹھڑی میں آ کر سو جاتا اور پہروں سویا رہتا۔ اس عمل کے دوران میں معلوم ہوتا تھا کہ گینڈا دراصل سو گیا ہے۔ کم از کم اس کا ذہن بالکل ماؤف ہوتا تھا۔ چوک والے جب کبھی دیکھتے کہ کوئی اس کے بازوؤں کی گرفت میں آ گیا ہے تو فی الفور سب کے سب اپنا کام کاج چھوڑ کر آ جاتے اور اسے اس قدر جھنجھوڑتے کہ اس کی نگاہیں اپنے گرفتار کی نگاہوں سے ہٹ جاتیں۔ جہاں اس کی نگاہیں ہٹتیں، وہ بیدار ہو جاتا اور اپنی گرفت ڈھیلی

چھوڑ دیتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر اس کا عمل ادھورا رہ جاتا تو بگڑی ہوئی کل کی طرح یہ دن بھر چڑ چڑا اور بد مزاج سا رہتا، مگر چوک والے اس کی بد مزاجی سہہ لیتے تھے اور خواہ مخواہ میں پکڑے تھانے نہیں جانا چاہتے تھے۔ غضب یہ تھا کہ گینڈا یہ عمل غصے میں یا بگڑ کر نہیں کرتا تھا بلکہ محض مشینی طور پر، محض اس لیے کہ کوئی اس کے سینے سے چھو گیا ہے۔ اس کی یہ خصلت کسی سے چھپی نہیں تھی اور کوئی بھی اسے جاننے والا حتی الوسع اس کے بہت قریب نہیں جاتا تھا۔ گو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ لوگ اس سے پرہیز کرتے تھے۔ لوگ اس سے بالکل ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا عام طور پر باقی چوک والوں سے، کیونکہ عام طور پر گینڈا انہایت متحمل مزاج، خوش باش بلکہ غیر معمولی طور پر ہمدرد اور خوش خُلق انسان تھا۔ کوئی گالی دے جائے، دھول دھپا بھی کرے، یہ بُرا نہیں مانتا تھا۔ بعض اوقات تو تفریحاً اپنی بے عزتی بھی کروا لیتا تھا۔ بایں ہمہ، اس کی چال ڈھال اور طور طریقوں میں ایک قسم کی درندگی ضرور تھی جو کبھی رعب دار معلوم ہوتی اور کبھی اسے بے زبان پالتو جانور کی شکل دے دیتی تھی۔ اگر یہ گینڈا کہلاتا تھا، اور اس کی ماں مائی خیری بھی اسے اسی نام سے جانتی تھی، تو بالکل مناسب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوئی اَور نام ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اس کا صحیح مصرف اگر کوئی سمجھا تھا تو حنیف پہلوان؛ باقی سب تو محض اس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔

گینڈے کا دستور یہ تھا کہ صبح صبح اٹھ کر نہاتا۔ نہانے کے بعد دیکھتا کہ مائی خیری اس کے لیے کیا پکا گئی ہے۔ اس کی صافی اور سلور کا کٹورا چولھے کے پاس اُپلوں کی گرم راکھ پر رکھا رہتا تھا۔ اگر کھانا پسند آتا تو خوب کھاتا ورنہ دو چار نوالے لے کر باقی احاطے

کے کتوں کے سپرد کر دیتا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کر ٹہلتا ہوا چوک کا رخ کرتا۔ چوک میں پہنچتا، سلام علیک ہوتی، لوگ نورے دودھ والے کی دکان پر لسی پی رہے ہوتے، رفیع پان والے سے سگریٹ لے رہے ہوتے۔ یہ بھی حقے کی چلم میں ہاتھ ڈال کر اس کا جائزہ لیتا، تھڑے پر اکڑوں بیٹھ جاتا اور چوک کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ نورا دیکھتا کہ گینڈا بیکار بیٹھا ہے، سامنے اسے اپنی کڑاہی نظر آتی جسے تازہ دودھ آنے سے پہلے مانجھنا بہت ضروری ہوتا۔ وہ گینڈے کو غور سے دیکھتا، جانچتا کہ مزاج کیسے ہیں۔ اگر کچھ تسلی بخش صورتحال معلوم ہوتی تو بات کرتا۔

''گینڈے! میں تیرا بڑا بھائی ہوں یا نہیں؟'' نورا یہ نہایت معمولی سا سوال کرتا۔

''ہاں!'' گینڈا جواب دیتا جیسے اس سے ایک حقیقت کی محض تائید کے لیے سوال کیا گیا تھا۔

''تو پھر یہ کڑاہی مانجھ دے۔'' نورا کہتا۔

''کیوں؟'' گینڈا پوچھتا۔ اسے گویا بالکل معلوم نہیں تھا کہ کڑاہی کیوں مانجھی جاتی ہے۔

''ابھی تازہ دودھ آنے والا ہے، اسے میں کہاں ڈالوں گا؟'' نورا بگڑ کر کہتا۔

''جہاں تیرا جی چاہے،'' گینڈا بڑی متانت سے کہہ کر منھ پھیر لیتا۔

نورے کو مکمل یقین ہو جاتا کہ گینڈا کڑاہی مانجھنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ بس ایک آنچ اور دینے کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ ایسے بولتا جیسے اسے ایک دم بے تحاشا غصہ آ گیا ہو۔

''میں کہتا ہوں ابھی دودھ آنے والا ہے۔ یہ بتا کہ میں تیرا بڑا بھائی ہوں یا نہیں؟ بس کہہ دے، ہاں یا نہیں؟''

گینڈا کوئی جواب نہ دیتا۔ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ نورا بھی اپنے کام میں ایسے مصروف ہو جاتا جیسے معاملہ ختم ہو چکا ہے اور اب مزید گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب حالات بالکل معمول پر آئے ہوئے نظر آتے تو گینڈا بڑی تمکنت سے اٹھتا، کُرتا اتار کر ایک طرف رکھ دیتا، شلوار کے پائینچے چڑھاتا، بھٹی سے سیر بھر راکھ، پسے ہوئے کنکر اور گھاس اٹھا کر کڑاہی میں ڈالتا اور اسے تھڑے کے برابر دیوار سے ٹیک دے کر خود اس میں کھڑا ہو جاتا۔ لوٹا بھر پانی راکھ پر ڈالتا اور پھر کڑاہی میں یوں گھومنے لگتا جیسے جیتی جاگتی بلونی ہو۔ اس کے پاؤں سے گھاس میں ملی ہوئی راکھ اور پسے ہوئے کنکر منٹوں میں کڑاہی کی صورت ہی بدل دیتے مگر اس کا یہ ناچ ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ نورا سوچنے لگتا کہ آج کڑاہی کے پیندے کی خیر نہیں مگر کچھ کہہ نہ پاتا۔ جب دس پندرہ منٹ گزر جاتے تو نورا اپنا خوف چھپاتے ہوئے ایسی صورت بناتا گویا اس کا جی باغ باغ ہو گیا ہے، اور کہتا، ''واہ وا، گینڈے! بس، ایک نمبر چمک گئی ہے کڑاہی!'' مگر گینڈے نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ کڑاہی میں گھومے جاتا اور جب تک اسے اطمینان نہ ہو جاتا کہ کڑاہی واقعی مانجھی جا چکی ہے، ختم نہ کرتا۔ اس کے بعد اسے خوب دھو کر شرط کرتا اور نورے سے کہتا، ''اب دیکھ لے، شیشہ ہو گئی ہے۔'' نورا تعریف کرتا لیکن اگر کہیں کوئی شخص بدقسمتی سے یہ بھی کہہ بیٹھتا کہ کڑاہی کا پیندا نکل گیا ہے تو گینڈا کڑاہی اٹھا کر چوراہے میں پھینک دیتا اور قسمیں کھا کھا کر کہتا، آئندہ جو نورے کا کام کرے وہ حرام کا

جنا ہوا کھلائے۔ سب لوگ خاموش رہتے مگر سب جانتے تھے کہ اگلے ہی روز اگر نورے نے پھر سوال کرلیا کہ گینڈے، میں تیرا بڑا بھائی ہوں یا نہیں؟ تو گینڈا پھر اس کی کڑاہی اسی کرّوفر سے مانجھے گا۔

گینڈے کو اگر نورا کام نہ دیتا تو رفیع کو گینڈے کی خدمات حاصل کرنے کا موقع مل جاتا۔ وہ گینڈے سے ایسے بات کرتا جیسے اس کے باپ کے سر پر کوئی احسان کرنا چاہتا ہے۔

''گینڈے! ٹھیلے کی سیر کرے گا؟'' رفیع پوچھتا۔

''کیوں؟'' گینڈا بے لوث انداز میں پوچھتا۔

''کیوں کیا؟ برف خانے میں میری برف پڑی پگھل رہی ہے اور یہاں گاہک مڑے جاتے ہیں، اَور کیوں؟'' وہ چمک کر کہتا۔

''پھر میں کیا کروں؟'' گینڈا جواب دیتا اور حقہ گڑگڑانے میں مصروف ہوجاتا۔

رفیع اَور تیزی سے بولتا، ''تُو کیا کرے؟ تو اٹھ اور برف خانے سے جاکر برف لا، اَور کیا کرے گا؟''

گینڈا خاموش رہتا۔ رفیع اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا اور پھر تھڑے سے اتر کر جاتا اور ٹھیلے میں گھوڑا جوت کر دکان کے سامنے لا کھڑا کرتا۔ خود آ کر بڑے اطمینان سے واپس اپنی گدی پر بیٹھ جاتا اور پان لگانے لگتا۔ جب معلوم ہوتا کہ بات آئی گئی ہو گئی ہے تو گینڈا تھڑے سے اترتا اور کود کر ٹھیلے پر سوار ہوجاتا۔ لگام دوہری کر کے دو چار پٹاپٹ گھوڑے کے لگاتا اور ٹھیلے پر ناچتا ہوا چوک کے چکر لگانے شروع کر دیتا۔ اس کا

سرکس کا کھیل پانچ دس منٹ تک جاری رہتا۔ کبھی ایک ٹانگ پر کھڑا ہوتا، کبھی لگام منہ میں لے کر تالیاں پیٹتا، کبھی گھوڑے کی طرف پیٹھ کر کے اسے چلاتا، اور جب تمام چوک والے خوب محظوظ ہو لیتے اور رفیع زوردار گالیوں پر اتر آتا کہ بے زبان کو کیوں پیٹتا ہے تو گینڈا شہر کو چلتا اور منٹوں میں رفیع کی برف لے کر لوٹ آتا۔ رفیع دیکھتا کہ گینڈے نے گھوڑے کو ہلکان کر دیا ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ گھوڑے سے لپٹ کر روئے مگر گینڈا ابھی دیکھ رہا ہوتا۔ رفیع محض بڑبڑا کر خاموش ہو جاتا، اور جو کہیں اس کے منہ سے ایک لفظ بھی شکایت کا نکل جاتا تو عین ممکن تھا کہ برف توڑنے کا سُوا لے کر گینڈا گھوڑے کو ہی قتل کر دیتا۔

گینڈے کی رواداری صرف نورے یا رفیع تک محدود نہیں تھی بلکہ سارے نور پور میں جاری و ساری تھی۔ رانجھا حمام میں پانی بھروانا چاہے تو بھروا لے، حاکم گنڈیری والا گنے چھلوا لے، سائیں بھولا لکڑی پھڑوا لے یا بستا مٹی کھدوا لے، گینڈا 'نہ' نہیں کہتا تھا، اور یہ ساری مشقت محض صاحب سلامت کی خاطر تھی۔ گو یہ بھی ضرور تھا کہ گینڈا اگر کسی سے کوئی چیز لینا چاہتا تو بے دھڑک لے لیتا تھا اور کسی کی اجازت یا خوشی سے واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے پاس کسی چیز کے لیے بھی پیسہ تو ہوتا نہیں تھا مگر اس کا کوئی کام محض اس لیے کہ اس کے پاس پیسہ نہیں، رکا نہیں رہتا تھا۔ رانجھے سے وہ جب جی چاہے سر منڈوا سکتا تھا، اس کے حمام میں جتنی مرتبہ اور جتنی دیر چاہے نہا سکتا تھا، رفیع کی دکان سے جیسا سگریٹ پان چاہے اٹھا سکتا تھا، نورے کی دکان سے اپنی مرغوب چیز برفی جتنی چاہے کھا سکتا تھا، غرض کہ بلا روک ٹوک وہ اپنی تمام ضروریات جیسے اس کا جی چاہے پوری کر سکتا

تھا۔ نورے سے اس معاملے میں بعض اوقات وہ ناراض بھی ہو جاتا تھا مگر نورا کہتا تھا، ''تو کھا، جتنی جی چاہے کھا، سارے نور پور کو برفی بانٹنے کا میں نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔'' بات یہ تھی کہ جس روز نورے کا بہت سا دودھ نہ بکتا، وہ رات کو اس کا کھویا بناتا۔ گینڈا بھی اس کے پاس بیٹھا کڑاہی میں کھرپی چلاتا۔ اگلے روز نورا ایک بڑے تسلے میں برفی جما کر اوپر چاندی کے ورق لگاتا اور سوچتا کہ گینڈا کتنی کھا جائے گا؟ باقی تو بکے گی اور دودھ اور ایندھن کی قیمت نکل آئے گی۔ مگر گینڈا جہاں دیکھتا کہ کوئی حریص نظروں سے اسے برفی کھاتے دیکھ رہا ہے، یہ مٹھیاں بھر بھر کر نورے کی برفی لٹانے لگتا۔ اس پر نورا بڑبڑاتا کہ دکانداری گئی چوراہے میں۔ مگر گینڈا اس پر خود بھی برفی کھانے سے انکار کر دیتا۔ آخر نورے کو مجبوراً گینڈے کو منانا پڑتا اور جتنی برفی اس کا جی چاہتا وہ دوسروں کو بھی کھلا دیتا۔

دن بھر گینڈا لوگوں کے مختلف نوع کے کام کرنے کے بعد سہ پہر کو عام طور سے نتھو کی بیٹھک پر چلا جاتا تھا۔ وہاں بیٹھا بینڈ باجے کی ریاضت سنتا رہتا۔ اگر دن میں اسے کوئی کام نہ کہتا تو کھڑا تاش یا شطرنج یا چوسر کی بازی دیکھتا رہتا۔ ان کھیلوں میں اسے دلچسپی بہت تھی۔ ہر کھیلنے والے کی ہر چال کو ایسے غور سے دیکھتا تھا گویا کھلاڑی کی دس آئندہ چالیں بھی سمجھ گیا ہے، مگر دراصل اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کھیل کیسے کھیلے جاتے ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر کبھی کسی نے اس سے کہا کہ آ گینڈے، بازی ہو جائے، تو عموماً نورا دودھ والا یا رفیع پان والا بول اٹھا کہ گینڈے کو یہ کھیل نہیں آتا اور گینڈا محض رواداری کے طور پر اس سے متفق ہو گیا۔ خود تو نہ کھیلا البتہ کھڑا دیکھتا رہا۔ اسی طرح

نھو کی بیٹھک پر وہ اکڑوں بیٹھا باجہ سنتا۔ ہر ایک دھن اسے پسند آتی اور وہ منھ کھولے ایسے تکتا جیسے کان کے راستے نہیں بلکہ منھ کے راستے گانا سنا جاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کلّوں پر رکھے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا، اس کی رال ٹپک ٹپک کر کرتا بھگو دیتی اور وہ حیرت کے مارے بوکھلا جاتا کہ ان سازوں میں سے کیسی کیسی آوازیں نکلتی ہیں۔ ٹرمپٹ کی کرخت آواز، حسّے کے ڈھول پیٹنے کی دھما دھم، بلبڑ کی تھالیاں پیٹنے کی چھنا چھن اور فیکے کی بھوں بھوں اسے اس قدر دلفریب معلوم ہوتی کہ کئی بار اس نے خود بھی ایک آدھ ساز بجانا چاہا، مگر فوراً ہی کسی نے کہہ دیا، ''گینڈے کو تو یہ بجانا نہیں آتا۔'' اس پر وہ اپنی رواداری میں فوراً اس ساز سے سبکدوش ہو کر بیٹھ گیا اور بینڈ باجے کی دھن سننے میں مصروف ہو گیا۔

گینڈا اپنی سادہ طبیعت، اپنی رواداری اور اپنی الگ رگ کے سر پر ایسی زندگی گزار رہا تھا جیسی باقی چوک والے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس کی قسمت کی لکیر دو فٹ رکھ کر سیدھی لگا دی ہے، مگر ہاتھ میں ایک ہی لکیر تو نہیں ہوتی؛ قسمت کی لکیر کتنی ہی سیدھی ہو، چاروں طرف کی باریک اور بل کھاتی ہوئی لکیریں اس میں آ کر ایسے الجھ جاتی ہیں کہ زندگی کا مطلب معنی ہی بدل جاتا ہے۔ ایک نہایت باریک اور نہایت پیچدار لکیر گینڈے کی قسمت کی لکیر سے ایسی آ کر ملی کہ وہ کچھ کا کچھ بن گیا۔ یہ لکیر نور پور کی سڑکیں بننے والے حادثے کی نمائندہ تھی۔

4

سائیں بھولے کا خیال تھا، اور بہت سے لوگ اس سے متفق تھے، کہ نور پور کی سڑکیں بننے کا واقعہ دراصل ایک معجزہ ہے اور اس کے ظاہر ہونے میں لال بادشاہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ معجزہ نہ ہوتا تو لال بادشاہ کا مزار کیسے پختہ بنتا، سائیں بھولے کے بالکے شمے کے لیے ایک کوٹھڑی کیسے تعمیر ہوتی اور درگاہ کو کیسے اِتنا عروج ملتا۔ خیر، یہ تو سوچنے کی بات ہے۔ واقعہ یوں ہوا کہ جن دنوں نور پور کی سڑکیں ابھی بالکل کچی تھیں اور کیچڑ دلدل کی وجہ سے کوئی پہیوں والی سواری ان پر چلنا مشکل تھی، ایک صبح نور پور والے بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دس بارہ بیل گاڑیاں اینٹوں سے لدی آئی ہیں اور گاڑی بان ان سے اینٹیں اتار اتار کر سڑک کے کنارے ان کے مربع ڈھیر لگا رہے ہیں۔ نور پور میں اینٹیں اور بیل گاڑیاں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ یہاں کم وبیش سب کے سب مکان مستقل طور پر زیرِ تعمیر تھے۔ جب کسی کو توفیق ہوتی، ایک دو بیل گاڑیاں اینٹوں کی منگوا لیتا اور اپنے مکان کی مکانیت میں اضافہ کر لیتا تھا یا کوئی کمی پوری کر لیتا تھا۔ لیکن اتنی بہت سی اینٹیں ایک ساتھ نور پور میں کبھی کسی نے دیکھی نہ سنی تھیں۔

ابھی خالی گاڑیاں نور پور سے جا نہیں چکی تھیں کہ دس بارہ اَور لدی لدائی آ پہنچیں

اور پھر ان کا ایسا تانتا بندھا کہ آٹھ دس دن لگاتار اینٹوں سے لدی گاڑیوں پہ گاڑیاں چلی آتی رہیں۔ کئی روز تک یہ عالم رہا کہ نور پور میں سوائے اینٹیں آنے کے اور کوئی واقعہ ہی نہ ہوا اور نور پور کی ٹھنڈی سڑک اور عزیز روڈ کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اینٹوں کے مربع ڈھیروں کی فصیلیں سی کھینچ دی گئیں۔ اب رفیع پان والے کی دکان پر بیٹھے بیٹھے رانجھے حجام سے بات کرنا مشکل ہو گیا بلکہ سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا بھی مشکل ہو گیا۔ بہت دور تک پہلے ایک فصیل میں دراڑ کی تلاش میں جانا پڑتا، پھر سڑک پار کر کے دوسری فصیل میں راستہ ڈھونڈنا پڑتا، تب کہیں نورے دودھ والے کی دکان سے مائی خیری کی بھٹی تک پہنچا جا سکتا۔ جب صورتحال یہ ہو گئی تو اور اینٹیں آنا بند ہو گئیں۔ پہلے تو نور پور والے ان مربع ڈھیروں کی موجودگی سے کچھ پریشان ہوئے، بے روک ٹوک آمدورفت میں ان کی مزاحمت بہت تنگ کرتی رہی، مگر آہستہ آہستہ ان کی موجودگی کی عادت سی ہو گئی اور ان کے فوائد بھی نظر آنے لگے۔ ان کا سب سے زیادہ فائدہ تو بچوں کو ہوا۔ اب ان کے گھروں سے سکول کا راستہ ایسا بے رونق نہ رہا جیسا پہلے تھا۔ پہلے وہ سڑک کی کیچڑ کے کنارے کنارے بنی پختہ پگڈنڈیوں پر سنبھل سنبھل کر آتے جاتے تھے کہ کپڑے میلے نہ ہو جائیں مگر اب وہ ان فصیلوں پر بھاگتے، ایک ڈھیر سے دوسرے پر چھلانگیں لگاتے آنے جانے لگے۔ سکول کے بعد انھیں ایک کھیل بھی کھیلنے کو مل گیا۔ وہ بہت سی اینٹیں برابر برابر کھڑی کر کے لمبی سے لمبی قطار بناتے تھے اور پھر قطار کی پہلی اینٹ کو زور سے ٹھوکر مارتے تھے۔ پہلی اینٹ دوسری پر گرتی اور دوسری تیسری پر، تیسری چوتھی پر، پھر ہر

ایک کا گر کر برابر والی کو گرانے کا ایسا سلسلہ چلتا جو آخری اینٹ تک جاتا۔ اسے وہ "گاڑی چلانا" کہتے تھے۔ اگر قطار کی تمام اینٹیں گر جائیں تو یہ "میل گاڑی" ہوتی تھی، اگر صرف چند ایک ہی گریں تو "کھڈا لائن" کہلاتی تھی۔ بچوں کے علاوہ خوانچے والوں نے دیکھا کہ ان پر دکان لگائی جائے تو دو طرفہ بکری ہوتی ہے۔ بے فکروں کو تاش اور چوسر کھیلنے کے لیے بنے بنائے تھڑے مل گئے اور بارش کے دنوں میں شہر آنے جانے کے لیے سارے نور پور کو دو رویہ پختہ پٹڑیاں مل گئیں۔ چند مہینوں کے بعد تو یہ صورت ہوگئی کہ نور پور والے ان لاوارث اینٹوں کو نور پور کا مستقل حصہ سمجھنے لگے اور ان کی موجودگی ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ رہی۔ اس عرصے میں مختلف ڈھیروں کے جغرافیائی قسم کے نام بھی رکھے جا چکے تھے۔ مثلاً رفیع والے ڈھیر وہ تھے جو اس کی دکان کے عین آگے تھے، حنیف پہلوان والے ڈھیر وہ تھے جو بی بی کے احاطے کے قریب اس کی زمین کے ٹکڑے کے آگے تھے، بابو کرم داد والے ڈھیر وہ تھے جن پر کھڑے ہو جائیں تو دور بابو کرم داد کا مکان نظر آتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ ان ناموں کی وجہ سے اب بات کرنے میں آسانی ہوگئی تھی۔ مثلاً اگر کوئی پوچھتا کہ تم نے امینہ کو کہاں دیکھا تھا، تو کہا جا سکتا تھا کہ مولے کے ڈھیروں کے پاس یا حنیف پہلوان کے ڈھیروں کے اِدھر یا اُدھر۔ یہ گویا ان کی جغرافیائی اہمیت تھی، مگر اس کی وجہ سے ایک دلچسپ تحریک بھی چلی جس کا اثر نور پور کی پوری تاریخ پر پڑا۔

ایک روز شمے نے حسے سے پوچھا کہ "تم نے سائیں بھولے کو کہاں دیکھا تھا؟"

"مولے کے ڈھیر کے پاس،" حسے نے کہا۔ "وہاں سے اس نے دو اینٹیں بھی

اٹھائی تھیں۔"

حسّے کو احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ بیٹھا ہے مگر بہت سے چوک والے اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگے۔

"مولے کے ڈھیر سے بھی دو اینٹیں اٹھائی تھیں اس نے؟" رفیع نے پوچھا اور پھر سارے چوک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "میرے ڈھیر سے بھی تو دو اینٹیں اٹھا کر لے گیا ہے۔"

"اور میرے ڈھیر سے بھی تو دو ہی لے گیا ہے،" نورا بولا۔

جب کوئی درجن بھر لوگ یہی فقرہ دہرا چکے کہ "میرے ڈھیر سے بھی تو دو اینٹیں لے گیا ہے سائیں بھولا،" تو حقیقت یہ کھلی کہ سائیں بھولے نے ایک بڑی زبردست سائنسی دریافت کی ہے۔ معلوم ہوا کہ سائیں بھولا دن میں بیس پچیس پھیرے عزیز روڈ اور ٹھنڈی سڑک کے لگاتا ہے اور سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے تمام ڈھیروں میں سے دو دو اینٹیں کر کے ہر بار لے جاتا ہے۔ وہ ایک پھیرے میں صرف دو اینٹیں ہی اٹھاتا ہے اور کسی ڈھیر سے دو سے زیادہ اس وقت تک نہیں اٹھاتا جب تک باقی تمام میں سے دو دو نہ اٹھا چکا ہو۔ دریافت اس کی یہ تھی کہ اگر ہر ڈھیر میں سے دو اینٹیں اٹھ جائیں تو کسی ڈھیر میں بھی اینٹوں کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ سارا نور پور سائیں بھولے کے ذہنِ رسا کی مار کا قائل ہو گیا۔ اس کی یہ دریافت تو لال بادشاہ کی درگاہ کی دریافت اور اس کی تاریخِ وفات معلوم کرنے سے بھی بڑی نکلی۔ اب حسّے کی سمجھ میں بھی آیا کہ سارا چوک کیوں اس کو گھورنے لگا تھا۔

سب جانتے تھے کہ حنیف پہلوان اور مہر جیون کی رضامندی سے سائیں بھولا لال بادشاہ کی درگاہ کو ترقی دے رہا تھا، مگر جب معلوم ہوا کہ درگاہ پختہ بنانے کے لیے وہ اینٹیں چُرا رہا ہے تو کچھ لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ حسا کہتا تھا کہ درگاہ کسی کی ہو، چوری کی اینٹ چوری کی اینٹ ہے، وہ درگاہ پر نہیں لگنی چاہیے۔ رفیع کا خیال تھا کہ کارِ خیر میں سب کچھ جائز ہے۔ شماں کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ اس کا مرشد نیک کام کر رہا ہے یا بد۔ ممکن تھا کہ یہ بحث بہت طول پکڑ جائے اور نور پور والے دو فریقوں میں بٹ جائیں، مگر اس آڑے وقت میں نتھو کی عقل و دانش کام آئی۔ اس کی دلیل نے سب کو لاجواب کر دیا۔ اس نے کہا:

"سنو! یہ اینٹیں سرکار کی ہیں، سرکار انگریز ہے، انگریز ہمارا دشمن ہے، اس لیے اس کا مال لینا جائز ہے۔ یہ مالِ غنیمت ہے اور اس پر ہمارا حق ہے۔ اور سنو! درگاہ پیروں فقیروں کی ہے، پیر فقیر سب کے لیے ایک سے ہیں۔ اگر سرکار ہماری ہوتی تو تمام پیروں فقیروں کی درگاہیں وہ بناتی۔ وہ نہیں بناتی تو ہم خود بنا لیتے ہیں۔ اس لیے سائیں بھولا اگر سرکاری اینٹوں سے لال بادشاہ کی درگاہ بناتا ہے تو سرکار ہی کا کام کر رہا ہے۔ کارِ سرکار کر رہا ہے، اس لیے جائز ہے۔"

نتھو کی دلیل ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ سرکاری ملازمین تک کو پسند آئی۔ کسی کو دلیل کا پہلا حصہ پسند آ گیا کسی کو دوسرا، بہرحال یہ بات وثوق کی حد کو پہنچ گئی کہ ان ڈھیروں سے اینٹیں لینا کارِ ثواب نہیں تو کارِ خیر ضرور ہے۔ شمے کا تذبذب تو ایسا ختم ہوا کہ وہ فوراً اٹھ کر سائیں بھولے کی مدد کو پہنچ گیا۔ اگلے روز گینڈا بھی اس کے ہمراہ چلا گیا۔

ہوتے ہوتے کم وبیش تمام نور پور والے بڑے انہماک سے لال بادشاہ کی درگاہ کی تعمیر میں مشغول ہو گئے۔ اب بالکل ثابت ہو گیا کہ یہ اینٹیں لال بادشاہ نے اپنا معجزہ دکھانے کے لیے منگوائی تھیں اور لال بادشاہ کا معجزہ یہ تھا کہ اس کا مزار پختہ بن گیا، شمے کی کوٹھڑی بھی بن گئی، مگر کیا مجال ہے جو کوئی نور پور کے اینٹوں کے ڈھیروں کو دیکھ کر کہہ سکتا کہ ان میں سے ایک اینٹ بھی اٹھائی گئی ہے۔ ہزاروں اینٹیں اٹھ گئیں مگر ڈھیر ویسے کے ویسے ہی رہے۔ اسے کہتے ہیں معجزہ — لال بادشاہ زندہ باد!

نھو کی دلیل لال بادشاہ کا مزار پختہ بنانے کے جواز تک ہی رہتی تو خیر ٹل جاتی مگر اسے نور پور کا بچہ بچہ لے اڑا۔ ہر شخص کہتا تھا کہ اینٹیں سرکاری ہیں اور انھیں سرکاری کام میں لانا چاہیے۔ اُدھر چاہ میراں روڈ پر نصب تختے پر لکھا تھا: ''نور پور سکیم، حکومت سے منظور شدہ،'' اور پھر لکھا تھا کہ یہاں کی گلیاں پچیس فٹ چوڑی پختہ ہیں، مگر یہاں دو بوندیں پڑیں تو سب گلیاں کچی ثابت ہو جاتی ہیں اور گھروں سے باہر نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بابو کرم داد کا خیال تھا کہ یہ سرکاری منظوری کی توہین ہے۔ اس نے پینتیس برس حکومت کی ملازمت کی تھی، وہ بھلا اپنی سرکار کی توہین کیسے برداشت کرتا۔ چنانچہ اس نے سرکار کی امداد کا فیصلہ کر لیا اور سائیں بھولے کا دریافت کیا ہوا نسخہ استعمال کرتے ہوئے ہر ڈھیر سے دو دو اینٹیں کر کے اٹھوائیں اور نور پور کی ٹھنڈی سڑک سے اپنے گھر تک کا راستہ پختہ بنوا لیا۔ اس کام میں گینڈے اور شمے نے بلا معاوضہ کام کیا اور دوسرے بہت سے لڑکے بھی دس دس بیس بیس اینٹیں اٹھا کر سرکار کی مدد کر آئے۔

جو کام بابو کرم داد صاحب کریں وہ باقی سب مالکانِ مکان کے لیے فرض ہو جاتا

تھا۔ اگر بابو کرم داد سرکار کی مدد کریں تو باقی کیسے پیچھے رہ جاتے! چنانچہ گینڈے، حسّے، شمے اور بلبھڑ تک کی مانگ ایسی بڑھی اور یہ لڑکے شرفا میں اس قدر مقبول ہوئے کہ انھوں نے سارے نور پور کی تمام گلیاں پکّی بنانے کا عہد کرلیا۔ یہ لڑکے ڈھیروں سے ڈھیروں اینٹیں اٹھانے کے ماہر بن چکے تھے۔ ایک ساتھ درجنوں ڈھیروں کے کونے ایسے غائب ہوتے جیسے کبھی تھے ہی نہیں، اور دھڑا دھڑ گلیاں اور گلیوں کے بعد بعض مکانوں کے صحن بھی پختہ ہو گئے۔ جب رفیع نے یہ نکتہ نکالا کہ ہر کارِ خیر کارِ سرکار ہے اور اس کی اور نورے کی دکان کے سامنے پکا تھڑا کارِ خیر ہے، تو یہ بھی مکمل ہو گئے۔ رانجھے حجام کا حمام خدمتِ خلق میں شامل تھا، وہ بن گیا۔ مائی خیری کی مدد عین ثواب کا کام تھا، اس کی بھٹی کے آٹھ ستون اور اوپر چھت تیار ہو گئی۔ پردہ اخلاقی فرض ہے چنانچہ درجنوں مکانوں کی منڈیریں بن گئیں۔ مطلب یہ کہ جب تک نور پور والے ایک ایک اینٹ جو وہ اٹھا سکتے تھے اٹھا نہ لے گئے، کارِ خیر مکمل نہ ہوا۔

آہستہ آہستہ نور پور میں اینٹوں کے تمام ڈھیر ایسے غائب ہوتے رہے جیسے برسات میں نمک کے ڈلے پگھل گئے ہوں، مگر نور پور کے بورڈ سے لے کر حنیف پہلوان کی زمین کی حد تک جتنے ڈھیر تھے وہ جوں کے توں رہے۔ حنیف پہلوان نے انھیں اپنی امان میں لے کر اوپر سفیدی کے چھینٹے ایسے ڈلوائے تھے کہ اگر کوئی ایک اینٹ بھی اٹھاتا تو چوری فی الفور پکڑی جاتی۔ نہ صرف یہ بلکہ حنیف پہلوان نے ایک چوکیدار پہرے پر بھی بٹھا دیا تھا کہ خبردار، کوئی ایک اینٹ تک نہ اٹھانے پائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جب نور پور کے باقی سب ڈھیر ایسے غائب ہوئے کہ کبھی یہاں ایک اینٹ

تک نہ تھی، تو یہ ایک طرف مربع کے مربع کھڑے ساری بستی کو چور کہتے معلوم ہوتے تھے۔ ہر شخص آتے جاتے انھیں گھورتا تھا اور دل ہی دل میں کہتا تھا کہ یا خدا، انھیں زمین میں غارت کر دے یا آسمان پر اٹھا لے۔ ظاہر ہے کہ نور پور والے نہایت نیک بندے تھے، چنانچہ ان کی دعائیں مستجاب ہوئیں۔

حنیف پہلوان نے جو پلاٹ بی بی کے احاطے اور سکول کے درمیان لے رکھا تھا اس پر مکان بنانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کا اپنا رہائشی مکان تک تو ابھی مکمل ہوا نہیں تھا، ایک اور بنانے سے اسے کیا فائدہ پہنچتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ نور پور میں سڑکیں پختہ بن جائیں، کچھ آبادی بڑھ جائے تو زمین کی قیمتیں چڑھیں گی اور یہ ٹکڑا بیچ کر وہ اپنا رہائشی مکان مکمل کر لے گا، مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ لال بادشاہ نے اپنا معجزہ دکھانے کے لیے نور پور میں اینٹوں کا من وسلویٰ بھیج دیا۔ اس کے بعد نتھو کی دلیل اور نور پور والوں کی ہمت نے حنیف پہلوان کو موقع دیا کہ وہ اپنے کاروبار کا مرکز نور پور میں منتقل کر لے۔ چنانچہ پہلے تو اس نے اپنے نام کی اینٹوں کے ڈھیر اپنی امان میں لے لیے، اور جب دیکھا کہ ان کی وجہ سے سارے نور پور کے ضمیر کو ٹھیس لگتی ہے تو گینڈے، نورے وغیرہ کی معاونت حاصل کیے بغیر اپنے پلاٹ پر عمارت لگوا دی اور تمام مستری وغیرہ اجرت دے کر رکھے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ حنیف پہلوان نے مفت میں مکان بنوا لیا ہے۔ ایک دو مہینے میں اچھا خاصا دو منزلہ مکان تیار ہو گیا اور نور پور والوں کو اس قدر خوشی ہوئی کہ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان کا ضمیر تسکین پا گیا کہ اب نور پور میں ایک اینٹ بھی ایسی نہ رہی جو کوئی چوری کر کے چور کہلا سکے — نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

گو نور پور والوں نے تمام ڈھیر غائب کر دیے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان میں مجلسی شعور اتنا تھا کہ ہر ڈھیر کے نچلے دو دو رد ّے انھوں نے نہیں چھوئے۔ اس کی وجہ سے نور پور کی ٹھنڈی سڑک اور عزیز روڈ دونوں پر دورویہ نہایت پکّی پٹڑیاں بن گئیں اور ان پر سائیکل سوار اور پیدل چلنے والے اب برسات میں بھی بخوبی آ جا سکتے تھے۔ ان کا ایک فائدہ اَور ہوا، اور وہ یہ کہ جب سرکار نے اینٹیں بھیجنے کے چند سال بعد بہت سے ٹرک پتھر اور کنکر سے لدے ہوے یہاں بھیجے تو ان کے ایک طرف کے دو پہیے بآسانی چلانے کے لیے پختہ سڑکیں مل گئیں۔ سڑک پر پتھر بچھانے سے پہلے بہت سے افسر نور پور میں آ کر ان پٹڑیوں کو اکھیڑ اکھیڑ کر کچھ ایسے ڈھونڈتے رہے جیسے یہاں ان کی کوئی سوئی گم ہو گئی ہو۔ معلوم نہیں انھیں وہ سوئی ملی یا نہیں، اتنا ضرور ہے کہ میاں محمد طفیل بی اے نے، سڑک بننے کے بعد، جب کنکر بچھ چکے، اوپر تارکول بھی چھڑکا جا چکا، ان پٹڑیوں سے ثابت کر دیا کہ پتھر کنکر کے نیچے اینٹوں کی ایک تہہ بھی موجود ہے۔ نور پور والوں کو بھلا کیا ضرورت پڑی تھی کہ میاں محمد طفیل سے اختلافِ رائے کرتے۔ انھوں نے خود گواہیاں دیں کہ یہاں نہایت اعلیٰ درجے کی اینٹیں استعمال ہوئی ہیں۔ اس پر تمام افسران، میاں محمد طفیل بی اے، سائیں بھولا، حنیف پہلوان، مہر جیون اور تمام نور پور والوں اور شرفا نے متفقہ فیصلہ دیا کہ نور پور کی سڑکیں بننے کا واقعہ سچ مچ ایک معجزہ ہے اور اس میں لال بادشاہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

5

نور پور والے مکانوں کی صرف دو قسموں سے واقف تھے: ایک وہ جسے مالک مکان خود اپنی رہائش کے لیے بناتا ہے اور دوسری وہ جسے کرائے پر اٹھانے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ تیسری کوئی قسم انھوں نے دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ اِدھر مکان کی تعمیر شروع ہوتی، اُدھر سب کو معلوم ہو جاتا کہ اس میں مالک مکان خود رہے گا یا اسے کرائے پر اٹھائے گا۔ دونوں قسموں کے طرزِ تعمیر اور فنِ تعمیر الگ الگ قسم کے تھے۔ اپنے رہنے کا گھر نور پور میں عام طور پر محبت سے زیادہ اور روپے پیسے سے کم بنتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سچی محبت کی طرح وہ مکان کبھی مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی تعمیر کبھی اختتام کو نہیں پہنچتی تھی بلکہ مستقل طور پر وہ زیرِ تعمیر رہتا تھا۔ آج ایک کمرہ بن گیا، کل ایک غسلخانہ، پھر چار دیواری کھینچ گئی۔ دروازوں کے پٹ لگ گئے تو کھڑکیوں کے آئندہ پر اٹھا رکھے۔ برسوں روغن پالش میں لگ گئے۔ کہیں سے رنگ برنگے شیشے مل گئے تو کھڑکیوں میں لگا دیے۔ بیل بوٹے زیادہ اور کام کا کام کم، مگر کام چلتا رہتا تھا اور ابھی پہلے کمرے کی چھت پڑتی تھی کہ مالک مکان مع اپنے خاندان اور مرغیوں کے اس میں آ جاتا تھا اور پھر اکثر مکان کے گرداگرد گھومتا، اِدھر ہاتھ لگا کر اینٹوں کی مضبوطی جانچتا، اُدھر ٹھونک بجا کر دروازوں کو پرکھتا نظر آتا تھا۔ ایک ایک اینٹ اسے اولاد کی طرح پیاری لگتی تھی اور ایک ایک کیل اس کی محبت کے

سہارے انکی رہتی تھی۔ ان مالکوں کی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو چھوٹی نوکریاں کرتے تھے، ایسی ملازمتیں جن میں انسان کی عزت بڑی ہوتی ہے اور معمولی معمولی باتوں سے بے عزتی ہو جاتی ہے، مگر تنخواہ محض اتنی ملتی ہے کہ وہ دو وقت کی دال روٹی چلا لیں۔ دفتروں کے بابو، ریلوے کے ٹی ٹی، انجمن کے سکولوں کے مدرّس وغیرہ نئی بستیوں کے معمار ہوتے ہیں۔ ان کے پیشے ایسے ہیں کہ ہر ایک کو اپنے آپ پر عقلِ کل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ اپنے مکانوں کے نقشے خود بناتے ہیں اور تعمیر کے کام اپنی نگرانی میں کراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے فنکاروں کے شاہکار دیکھتے ہی پہچان لیے جاتے ہیں اور اگر کوئی ان تعمیرات کو دیکھ کر مسکرا دے تو بابو کرم داد اور طالع مند اور دیگر اصحاب زندگی بھر کے لیے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ان مکانوں پر ان کی ہڈیوں کا گودا لگا ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت اب انھیں مستقل دردِ سر یا پیٹ کی بیماری لگی ہوتی ہے، دانت جھڑ رہے ہوتے ہیں اور سر کے بال سفید ہو کر گر رہے ہوتے ہیں۔ بعض شرفا پر قرضوں کا بوجھ بھی چڑھ گیا ہوتا ہے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے فن پارے کو کوئی حقارت کی نظر سے دیکھے۔ یہ مکان اپنے مالکوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہوتے ہیں اور ہر ایک کو اپنی شبیہ عموماً بہت پیاری لگتی ہے۔

کرائے پر دینے والے مکان کی شکل صورت ہی الگ ہوتی ہے۔ اس کی تعمیر میں محض کاروباری جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ایسے بے لوث طریقے پر بنائے جاتے ہیں جیسے ترازو کے ایک پلڑے پر کرایہ رکھ کر دوسرے میں مکان کو تولا گیا ہو۔ جتنا مکان اس کرائے کے بٹے پر چڑھا ہو بس اتنا ہی بنایا گیا ہو۔ بہت کیا تو چلو دو اینٹیں زیادہ چڑھا

دیں۔ ان مکانوں میں ضرورت کی تمام چیزیں ہوتی ہیں اور ایسے بنتے ہیں جیسے تمام مزدور، مستری، بڑھئی جلدی میں ہوں؛ انھیں کام سے جانا ہو اور اس سے پہلے اس مکان کو مکمل کرنا ہو۔ اس کی ٹیپ ٹاپ، رنگ، پالش سب ایک ساتھ ہو جاتی ہیں اور چھپا ہوا ایک اشتہار لگ جاتا ہے کہ مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ ملنے کا پتا: فلاں فلاں صاحب، فلاں جگہ، لاہور۔ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور جسے پسند آ جائے وہ قرآن مجید اور پانی کی ایک گاگر اس میں رکھ جاتا ہے کہ کوئی اَور دیکھنے آئے تو اسے معلوم ہو جائے کہ مکان چڑھ گیا ہے، اور پھر اس میں منتقل ہو جاتا ہے، اللہ اللہ خیر سلاّ۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ مکان کرائے کا ہے۔

نور پور میں ایک مکان بھی ایسا نہیں تھا جو ان دو قسموں سے باہر ہو، لیکن جب نور پور کی سڑکیں بننے کا واقعہ ہوا تو ایک مکان ایسا بن گیا جو اِن قسموں میں سے کسی کی روایات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ یہ تھا حنیف پہلوان کا وہ مکان جو بی بی کے احاطے اور مدرسے کے درمیان نور پور کی ٹھنڈی سڑک سے ذرا ہٹ کر ڈورے شاہ کے مزار کے پچھواڑے بنا تھا۔ اس کی تعمیر غیر معمولی حالات میں ہوئی تھی مگر طرزِ تعمیر وہ استعمال ہوا تھا جو کرائے پر دینے والے مکانوں کے لیے مخصوص تھا، تاہم اس پر چھپا ہوا اشتہار نہیں لگا تھا کہ یہ کرائے کے لیے خالی ہے۔ حنیف پہلوان کا اپنا رہائشی مکان باقی ذاتی مکانوں کی طرح بدستور زیرِ تعمیر تھا اور آئے دن مستری مزدور آ کر اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی، کوئی نہ کوئی اضافہ کرتے رہتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ حنیف پہلوان اسی مکان میں مستقل طور پر رہے گا۔ اور پھر اس نے کبھی ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ اپنا رہائشی مکان یا نیا مکان

کرائے پر دینا چاہتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ اگر ایک مکان کرائے پر نہیں دے گا تو حنیف پہلوان دو مکانوں کو بیک وقت اپنے پاس رکھ کر کیا کرے گا؟ یہی نہیں، نور پور میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کا اپنا رہائشی مکان یہاں ہو اور اس کے علاوہ وہ کسی مکان کا مالک ہو۔ اگر کسی میں اتنی استطاعت ہوتی کہ نور پور میں ایک سے زیادہ مکان بنوائے تو وہ بھلا یہاں کیوں رہتا؛ وہ صرف کرائے کے لیے مکان بنواتا اور خود شہر میں رہتا، یا دونوں کی قیمت سے کسی ٹھاٹھ دار جگہ مکان بنواتا۔ چنانچہ سب کو دال میں کچھ کالا ضرور نظر آتا تھا۔ مگر دو مکانوں کا مالک ہو جانے کی وجہ سے حنیف پہلوان کی حیثیت نور پور میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب کوئی اس سے کھلم کھلا یہ پوچھ نہیں سکتا تھا کہ پہلوان، تم نے وہ دوسرا مکان کیوں بنوایا ہے؟ بہر حال، یہ سوال ہر شخص کو تنگ کر رہا تھا اور لوگ کچھ سمجھ نہیں رہے تھے کہ یہ کیا ہوا ہے۔ صرف ایک نتھو تھا کہ اس سوال میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ اگر کبھی اس مسئلے پر چوک میں بات بھی ہوتی تو وہ خاموش بیٹھا رہتا۔ سب لوگ اس کی سمجھ بوجھ کے تو قائل تھے۔ سب جانتے تھے کہ اگر اس کی صحیح آنکھ وہی کچھ دیکھتی ہے جو سارا جہان دیکھتا ہے تو اس کی کانی آنکھ وہ کچھ دیکھتی ہے جو اَور کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ صحیح آنکھ باہر کی چیزیں دیکھتی تھی تو کانی آنکھ دلوں کے راز۔ اس کی صحیح آنکھ دیکھ رہی تھی کہ مائی خیری نے حنیف پہلوان کے نئے مکان پر آمد و رفت شروع کر دی ہے۔ سب چوک والے بھی دیکھتے تھے کہ جیسے مائی خیری حنیف پہلوان کے رہائشی مکان پر اور دوسرے شرفا کے مکانوں پر جاتی ہے ویسے ہی کبھی کبھار حنیف پہلوان کے نئے مکان پر جاتی ہے، بلکہ اس کی صفائی کے لیے اپنے ساتھ ایک دو بھنگیوں کو بھی لے جاتی ہے۔ نتھو نے یہ دیکھا اور باقی سب

چوک والوں نے بھی دیکھا کہ مائی خیری ایک دو مرتبہ حنیف پہلوان کے نئے مکان کی صفائی کے لیے جاتے ہوئے امینہ کو بھی ہمراہ لے گئی ہے۔ یہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مائی خیری کئی مرتبہ امینہ کو اپنے ہمراہ کئی مکانوں میں لے جاتی تھی۔ مگر نھتو کی کانی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی تھی وہ اس کا منھ بند کیے تھا۔ نھتو تھا تو چوک ہی کا فرد، اس کا منھ بہت دن تک بند نہ رہ سکا، اور جس روز کھلا اُس روز سے سارے نور پور کو ایک طرح کا چین مِل آ گیا۔

نھتو کا منھ کھلنے کا واقعہ یوں ہوا کہ ایک روز ایک اجنبی نے رفیع پان والے کی دکان پر آکر سلام کیا اور پوچھا:

"کسی صاحب کو معلوم ہے کہ ڈورے شاہ کے مزار کے پیچھے جو نیا مکان بنا ہے وہ کس کا ہے؟"

نور پور کے چوک میں اجنبیوں کا آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ہر روز کئی ایک آتے تھے — کوئی کرائے کا مکان ڈھونڈنے، کوئی بکاؤ زمین دیکھتا، کوئی کسی نور پور والے یا شریف زادے سے ملنے — اور عام طور پر رفیع پان والے کی دکان سے انھیں مکمل اطلاعات مل جاتیں۔ کوئی ان کو خاص اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ہر شخص اپنے کام میں لگا رہتا تھا اور اجنبی سے بات بھی کرتا رہتا تھا۔ اس اجنبی کو بھی آتے سب نے دیکھا تھا۔ رفیع پان والا بڑی تیزی سے پان لگا لگا کر اپنے اڈے کے سامنے ٹین سے ڈھکے تختے پر سوکھنے کے لیے ڈال رہا تھا۔ تھڑے پر نھتو اور حاکم گنڈیری والے نے شطرنج کی بازی لگا رکھی تھی۔ وہ بڑے نازک مرحلے پر پہنچ چکی تھی۔ حسنا ہاتھ میں حقہ لیے حاکم کے برابر کھڑا تھا اور اسے ایک چال بتانے کی خواہش کو بڑی سختی سے دبانے کی کوشش میں جلدی جلدی

کش لگا رہا تھا۔ نورا دیکھ رہا تھا کہ حسنا چلم برباد کر رہا ہے مگر اس نے برفی سے ابھی ایک خوان سجایا تھا اور تھڑے کے قریب کھڑے گینڈے کی ہستی کو اس اعتماد سے بھولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کبوتر کی طرح اگر اس نے اس بلّے کو حاضر ناظر نہ جانا تو شاید اس کی برفی بچ جائے گی۔ اُدھر بلبھڑ تھڑے پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں آسمان پر لگی تھیں جہاں ایک کبوتر قلابازیاں کھا رہا تھا اور دوسرا اس کے گرداگرد چکر کھاتا اڑ رہا تھا۔ اجنبی نے بھی سلام کرنے اور سوال پوچھنے کے بعد ان کبوتروں کو دیکھنے کے لیے نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور پھر نیچی کی ہی تھیں کہ اس نے دیکھا کہ سارے چوک والے اسے گھور رہے ہیں۔ اجنبی گھبرا گیا — وہ کیا کہہ بیٹھا ہے۔ اس نے باری باری ہر ایک کی جانب دیکھا۔ وہ جس کی طرف دیکھتا وہ نگاہ چرا جاتا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ رفیع پان والے کے ہاتھ پان لگاتے لگاتے وہیں رک گئے ہیں جہاں اجنبی نے اس مکان کا نام لیا تھا۔ حقے کی نلی حسنے کے منہ میں ایسے اٹک گئی ہے جیسے اس کے ہونٹوں سے چمٹ گئی ہو۔ حاکم اور نھو کے ہاتھوں میں مُہرے پکڑے کے پکڑے رہ گئے ہیں۔ گینڈے کے ہاتھ میں برفی اس کے منہ سے چار انچ کے فاصلے پر رکی کھڑی ہے اور منہ اس انتظار میں کھلا ہے کہ برفی آئے مگر ہاتھ آگے نہیں چلتا۔ اجنبی یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ گینڈے کا ہاتھ ہلا، برفی اس کے منہ میں گئی اور اس سے ایک آواز نکلی:

”حنیف پہلوان کا!“

اس آواز کے نکلتے ہی سب کی نظریں گینڈے پر آ ٹکیں۔ اجنبی نے ان سے نجات پا کر پوچھا:

''مکان خالی ہے؟''

بارہ چودہ نظریں پھر اجنبی کے چہرے پر آ جمیں اور ایسی جمیں کہ ان کے جمے جمے حاکم اور نتھو تھڑے سے اتر آئے، رفیع چھلانگ لگا کر اجنبی کے سامنے کھڑا ہو گیا، چاروں طرف سے چوک والے آئے اور انھوں نے اجنبی کے گرد حلقہ بنالیا اور پھر چھ سات آوازیں ایک ساتھ نکلیں:

''ہاں خالی ہے!''

سب چوک والے ایک دوسرے کی آواز سے بدکے، ایک دوسرے کو گھورا اور جیسے ان کے اعصاب تسکین پا چکے ہوں، دو دو قدم پیچھے ہٹ کر، حلقہ توڑ کر، سیدھی قطار بنا کر اجنبی کے برابر کھڑے ہو گئے۔ ایک دو لمحہ خاموشی رہی۔ وقت سب کو بوجھل معلوم ہونے لگا۔

''حنیف پہلوان کی رہائش کہاں ہے؟'' اجنبی نے پوچھا۔

اس پر چوک والوں میں ہلچل مچ گئی۔ ہر ایک اجنبی کو بتا رہا تھا کہ حنیف پہلوان کا رہائشی مکان کہاں ہے اور وہاں جانا ہو تو ٹھنڈی سڑک سے جا سکتے ہیں، عزیز روڈ سے جا سکتے ہیں یا رفیع پان والے کی دکان کے اندر جا کر اس کے پچھلے دروازے سے نکل کر بالکل سیدھے جائیں تو سامنے حنیف پہلوان کا مکان ہے۔ اجنبی نے اِدھر اُدھر دیکھا، رفیع پان والے کی دکان کے اندر دیکھا، پیچھے ہٹ کر حنیف پہلوان کے مکان کی طرف دیکھا، کچھ ٹھٹکا اور پھر ٹھنڈی سڑک پر چلنے لگا۔ اس نے ایک قدم اٹھایا تو بیس پاؤں اس کے پیچھے ایک ایک قدم آگے بڑھے۔ اس نے دوسرا قدم اٹھایا تو یہ بیس پاؤں بھی اس

کے پیچھے بڑھے۔ اجنبی نے مڑ کر دیکھا تو یہ بیس پاؤں ایسے رک گئے جیسے فوج کو اس کے کمانڈار نے ''ہالٹ'' کا حکم دے دیا ہو۔ اجنبی ٹپٹایا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر رکا رہا اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھاتا حنیف پہلوان کے رہائشی مکان کی جانب چلا۔ چوک والے رکے کھڑے رہے، لیکن جب اجنبی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا معلوم ہوا تو یکدم لپکے اور ٹھنڈی سڑک کے کنارے قطار بنا کر ایسے کھڑے ہو گئے جیسے مچان پر شکار کے انتظار میں ہوں۔ یہاں سے انھیں حنیف پہلوان کے رہائشی مکان کا دروازہ نظر آتا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اجنبی نے حنیف پہلوان کے دروازے پر دستک دی اور پھر چاروں طرف دیکھا۔ اسے کوئی خاص چیز نظر نہ آئی۔ پھر اس نے اوپر دیکھا۔ چوک والوں نے بھی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ آسمان پر ابھی تک وہ کبوتر قلابازیاں کھا رہا تھا اور دوسرا کبوتر اس کے گرد اڑ رہا تھا، مگر حسا ان میں دلچسپی نہ لے سکتا تھا، بیتاب ہو رہا تھا کہ حنیف پہلوان کے نئے مکان کی تازہ ترین خبر ملے۔ اس نے دیکھا کہ حنیف پہلوان مکان سے باہر آیا ہے اور اجنبی سے صرف ایک دو باتیں ہوئی ہیں۔ اجنبی نے پلٹ کر ان نور پور والوں کو دیکھا تو حسے نے باقیوں کو جھنجھوڑ کر کبوتروں میں انہماک سے باہر نکالا۔ اب سب کی نگاہیں پھر اجنبی پر جم گئیں۔ وہ لوٹ رہا تھا، نور پور والوں کے قریب آ رہا تھا۔ یہ سب چاہتے تھے کہ بھاگ کر اس کے قریب پہنچیں اور پوچھیں کہ حنیف پہلوان نے کیا کہا، مگر ان کے پاؤں زمین پر ایسے جم چکے تھے کہ پوری کوشش کے باوجود کوئی ایک قدم بھی چل نہ سکا۔ اجنبی اتنی مدھم رفتار سے معلوم نہیں کیوں آ رہا تھا جیسے اسے کسی بات کی کوئی جلدی نہ ہو۔ اجنبی کے نزدیک پہنچنے تک نور پور والے بے حال ہو چکے تھے۔

جب وہ اتنا قریب پہنچ گیا کہ چوک والوں کی آواز اسے بخوبی سنائی دے سکے تو دس زبانیں یکدم حرکت میں آئیں۔

''مل گیا؟ لے لیا؟''

''نہیں،'' اجنبی نے کہا۔ ''حنیف پہلوان کہتا ہے کہ مکان کرائے پر دینے کے لیے نہیں بنایا۔''

''مکان کرائے پر دینے کے لیے نہیں بنایا؟'' سب نے یہ فقرہ دہرایا۔

''ہاں!'' اجنبی نے کہا۔ ''مکان کرائے پر دینے کے لیے نہیں بنایا۔ یہاں وہ بیٹھک بنائے گا۔''

اجنبی تو اتنا کہہ کر چاہ میراں روڈ کی طرف چل دیا، چوک تورپور والے حیران پریشان ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

''یہاں وہ بیٹھک بنائے گا،'' سب نے کہا۔

''بیٹھک کیوں بنائے گا؟'' کسے نے پوچھا، اور سب رفیع پان والے کی دکان کی جانب چلنے لگے۔

نتھو نے اپنی صحیح آنکھ بند کر لی تھی اور کانی آنکھ کھول لی تھی۔ تھڑے کے قریب پہنچ کر اس نے بلہڑ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا اور تھڑے سے نیچے اتار لیا۔ بلہڑ نیچے تو اتر آیا مگر اس کی نگاہیں بدستور آسمان کی طرف لگی رہیں اور قلابازیاں کھاتے کبوتر کو دیکھتی رہیں۔

''بیٹھک کیوں بنائے گا؟'' رفیع نے اپنے تھڑے پر چڑھتے ہوئے پھر پوچھا

اور پان لگانے لگا۔ ہر ایک اپنے اپنے مشغلے میں پھر مصروف ہونا چاہتا تھا۔ حسّے نے بیٹھ کر شطرنج کے مہروں کو گھورنا شروع کیا اور جیسے تھو پھٹ پڑا ہو۔ اس نے چلاّ کر کہا:

''بیٹھک کیوں بنائے گا؟ تم پوچھتے ہونا؟ سنو! حنیف پہلوان جوا کھلوائے گا۔ بیٹھک پر جوا خانہ بنے گا!'' یہ کہہ کر اس نے بلھڑ کا بازو کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا ساتھ لے کر اپنی بیٹھک کی طرف چلا گیا۔

حسّے کو جیسے اعتبار نہ آیا ہو۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، ''بیٹھک پر جوا کھلوائے گا!''

''ہاں!'' گینڈے نے کہا اور برفی کی ایک مٹھی بھر کر منھ میں ڈالی۔ ''بیٹھک پر جوا خانہ بنے گا!'' اور یہ کہہ کر اپنے احاطے کی جانب چلا گیا۔

6

جب سے نور پور میں خبریں آنے لگی تھیں کہ آئندہ الیکشن کے موقع پر ہندو اور سکھ مل کر فساد کرانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، حنیف پہلوان، سائیں بھولا اور مہر جیون ہر شام چوک میں رفیع پان والے کے تھڑے کے سامنے رکھی بنچ پر آ کر بیٹھنے لگے تھے۔ یہ تو خیر، خود میاں محمد طفیل بی اے بھی کبھی کبھار آ ٹپکتے تھے اور حنیف پہلوان، سائیں بھولے اور مہر جیون کے ساتھ مل کر ان خبروں پر تبصرہ کرتے تھے۔ ابتدا میں چوک والوں نے ان خبروں پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بہت دیکھی ہیں تیاریاں، ان لالوں سے کیا ہو سکتا ہے! جمع کر لیں اسلحہ جتنا چاہیں، مسلمان بچے نے ایک نعرہ لگایا تو یہ سب بکری ہو جائیں گے۔ مگر جب حنیف پہلوان کی خبروں کی تصدیق بھی ہونے لگی تو نور پور والے ان معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔

ایک روز حنیف پہلوان نے خبر دی کہ ہندوؤں نے رام گلی کے دونوں سروں پر لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگا دیے ہیں اور ان کے پیچھے مورچے بنا لیے ہیں۔ یہ خبر بہت سنسنی خیز تھی۔ چوک والے رفیع پان والے کے ٹھیلے پر برف لانے گئے تو ایک چکّر رام گلی کا بھی لگا آئے۔ آ کر انھوں نے اطلاع دی کہ رام گلی کے دونوں سروں پر پھاٹک ضرور لگ گئے ہیں، مگر مورچے انھیں کہیں نظر نہیں آئے۔

''تمھارے دکھانے کو بنائے ہیں مورچے انھوں نے؟'' سائیں بھولے نے چمک کر کہا۔ ''تم شکر کرو کہ بچ کر آ گئے ہو۔ مرشد کو دعائیں دو۔ تمھارا مرشد سچا ہے، جو بچ گئے ہو، ورنہ رام گلی والوں نے اپنے مورچوں میں کہہ رکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان آئے تو بچ کر نہ جائے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے،'' مہر جیون نے کہا۔

چوک والے ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔ اگر آدھی خبر صحیح تھی تو عین ممکن تھا کہ ساری کی ساری صحیح ہو۔ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ حنیف پہلوان، سائیں بھولے اور مہر جیون کا گٹھ جوڑ نتھو کے بینڈ باجے کی طرح تھا۔ حنیف پہلوان ٹرمپٹ تھا، اس کا کام تھا خبر دینا؛ سائیں بھولا طوطی تھا، یہ جذبات کا خیال رکھتا تھا، اور مہر جیون کی حیثیت فیکے کے دھوتُو والے باجے کی تھی، یہ ساتھ کا کام دیتا تھا اور حنیف پہلوان کی دھن میں زور پیدا کرتا تھا۔ میاں محمد طفیل خود نتھو کی جگہ تھا۔ وہ ساری کارروائی کی صحت برقرار رکھتا تھا۔ ہر خبر موقعے پر سنائی جاتی تھی اور اس کے اثرات کا بغور مطالعہ کیا جاتا تھا۔

''یہ رام گلی تو دور ہے، تم ارجن نگر کی بات سن لو!'' ایک روز سائیں بھولے نے کہا۔ ''گرنتھیوں نے بنارس سے ایک استاد منگوایا ہے۔ جا کر دیکھو۔ وہ واہگورو کے خالصوں کو تلوار اور گتکے چوکھی کے وہ ہاتھ سکھا رہا ہے جن کا توڑ سارے پنجاب میں نہیں،'' حنیف پہلوان نے بتایا۔

''توڑ کیوں نہیں؟'' نتھو نے پوچھا۔ ''پنجابی ہاتھ واتھ نہیں جانتا۔ وہ تو بس ان پوربیوں کو ایسے دیکھتا ہے اور یہ ایسے بھاگتے ہیں جو بھاگنے کی شرط ہے۔'' نتھو نے کانی

آنکھ بند کر کے عجیب و غریب صورت بنائی اور گردن ایک طرف جھکا کر ایسے قہر سے اپنی صحیح آنکھ پوری کھول کر دیکھا کہ سب خوفزدہ ہو گئے۔

''بڑا آیا پورب والا!'' اس نے کہا۔ ''ایک نعرہ لگے حیدری جو نعرے کی شرط ہے، اور یہ سب واہگورو کے خالصے بھیڑیں بن جائیں۔''

نھو بدستور حزبِ مخالف بنا تھا مگر اس روز بابو کرم داد کی معاونت حنیف پہلوان کو میسّر تھی۔ وہ اپنی ایک مہین سی ٹنگڑی دوسری مہین سی ٹنگڑی پر رکھے، لٹکتے ہوئے پاؤں کو ایسے ہلا رہے تھے جیسے کباب بنانے کے لیے خلیفہ اپنی آگ کو پنکھا جھلا کرتا تھا۔ نعرۂ حیدری کا نام سن کر وہ تن گئے۔ انھوں نے اوپر کی ٹنگڑی زمین پر رکھ دی اور نیچے والی اس کے اوپر لے آئے اور اب دوسرا پاؤں ہلاتے ہوئے بولے، ''نعرۂ حیدری کے ساتھ بازوے حیدر بھی بنانے چاہییں،'' اور اپنے فقرے پر اس قدر خوش ہوئے کہ مسکرانے لگے اور حقے کی کلی پر رکھی ہوئی مٹھی سے منھ لگا کر اس کے اوپر سے جھانکتے ہوئے دیکھنے لگے کہ ان کے مقولے کا دنیا پر کیا اثر ہوا ہے۔

میدان خالی دیکھ کر سائیں بھولا اٹھا اور اپنا وہ بازو اٹھا کر جو دوسرے سے بڑا تھا اور چھوٹے بازو والے ہاتھ کو کان پر رکھ کر چلّایا:

''ایک نعرۂ حیدری!''

سارے چوک والے جواب میں بولے، ''یا علی!''

چوک گونج اٹھا۔ جو لوگ دور تھے، وہ بھی دیکھنے لگے کہ کیا ہوا ہے اور قریب آ گئے۔

''یہ ٹھیک ہے!'' مہر جیون نے کہا۔

میاں محمد طفیل بی اے نے جب مجمع دیکھا تو تقریر کرنے کی رگ پھڑک اٹھی۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بنچ پر چڑھ گئے اور اتنے زور سے چلّانے لگے جیسے ہزاروں کا ہجوم ان کی تقریر سننے آیا ہو۔

''برادرانِ اسلام!'' انھوں نے کہا، ''میں ہر روز صبح نماز سے پہلے دریا پر سیر کرنے جاتا ہوں، اور جب میں سیر کرنے دریا پر جاتا ہوں تو وہاں میں کیا دیکھتا ہوں؟ میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ وہاں میں کیا دیکھتا ہوں۔ میں وہاں دیکھتا ہوں کہ ہندو لڑکے، ہندو نوجوان، بس آپ کی عمر کے، بلکہ آپ سے بھی کم عمر کے، وہاں آتے ہیں۔ نماز سے پہلے، صبح منھ اندھیرے آتے ہیں، جب آپ سب مسلمان خوابِ خرگوش میں پڑے سوتے ہیں، جب آپ خرّاٹے لے رہے ہوتے ہیں، اُس وقت ہندو اپنے بستروں سے اٹھ کر دریا پر آ جاتے ہیں اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اور پھر میں دیکھتا ہوں، اپنی اِن آنکھوں سے دیکھتا ہوں جو اِس وقت آپ کو دیکھ رہی ہیں، اور ان آنکھوں سے میں کیا دیکھتا ہوں؟ یہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کیا دیکھتا ہوں۔''

نھتو نے اپنی صحیح آنکھ بند کر لی اور کانی آنکھ سے میاں محمد طفیل، حنیف پہلوان، سائیں بھولے اور مہر جیون کو دیکھنے لگا۔

''میں دیکھتا ہوں...'' میاں محمد طفیل نے تقریر جاری رکھی۔ اچکن کے بٹن کھول کر ایک ہاتھ کولھے پر رکھ لیا اور دوسرا اوپر اٹھا لیا، جیسے اپنے بازو کے پٹھے سب کو دکھانا چاہتا ہو۔ ''یہی دیکھتا ہوں کہ پچاس ساٹھ ہندو لڑکے یہاں ہیں، پچاس ساٹھ وہاں ہیں

اور پچاس ساٹھ اِدھر اُدھر ہیں۔ اور یہ سب ہندو لڑکے لنگوٹ باندھے ہوتے ہیں۔ ان کی بودیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کیوں کہتا ہوں کہ یہ لڑکے ہندو ہوتے ہیں، مسلمان نہیں ہوتے، آپ کے بھائی نہیں ہوتے۔ آپ کے بھائی تو ابھی سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہندو ہوتے ہیں۔ ان کی بودیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں، ان آنکھوں سے جن سے اب میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔

''اور یہ ہندو لڑکے صبح صبح دریا پر کیا کرتے ہیں؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیا کرتے ہیں۔''

میاں محمد طفیل نے اپنی آواز نہایت دھیمی کر لی اور دونوں بازو اوپر اٹھا کر ہلانے لگا، پھر بولا، ''وہ ہندو لڑکے ورزش کرتے ہیں۔''

اس نے ایک خفیف سا وقفہ دیا اور پھر یوں چلّایا جیسے اسے آگ لگ گئی ہو:

''وہ ہندو لڑکے ورزش کرتے ہیں، تیل کی مالش کرتے ہیں، ڈنڈ پیلتے ہیں، بیٹھکیں نکالتے ہیں، کُشتی کرتے ہیں، ریت پر دوڑتے ہیں، انگریزی مکہ بازی کرتے ہیں، کسرت کرتے ہیں، اور یہ ہندو لڑکے ورزش کرنے کے بعد اشنان کرتے ہیں اور اشنان کرنے کے بعد کپڑے پہن لیتے ہیں اور ورزش ختم کر کے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

''برادرانِ اسلام! اگر بات اتنی ہی ہوتی تو میں کچھ نہ کہتا۔ میرا دل تو اس بات سے دُکھتا ہے کہ جب ہندو لڑکے وہ ورزشیں کرتے ہیں جو دراصل مسلمانوں کی ہیں... یہ

سب ورزشیں مسلمانوں کی ہیں...''

سائیں بھولا مسلمانوں کا نام آتے ہی چلّایا، ''نعرۂ تکبیر!''

''اللہ اکبر!'' چوک والوں نے کہا۔ میاں محمد طفیل نے جھک کر سائیں بھولے کے کان میں کچھ کہا اور پھر سینہ تانے کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگا۔ سائیں بھولے نے دونوں بازو اوپر اٹھائے اور پورے زور سے چلّایا:

''میاں محمد طفیل!''

چوک والے اتنا تو جانتے تھے کہ کس نعرے کے جواب میں کیا کہا جاتا ہے۔

وہ یک زبان ہو کر چلّائے، ''زندہ باد!''

میاں محمد طفیل نے حاضرین کو سلام کیا اور اپنی تقریر جاری رکھی۔

''تو برادرانِ اسلام! میں کہہ رہا تھا کہ یہ ورزشیں مسلمانوں کی ہیں مگر مسلمان سوئے ہوئے ہیں۔

''اب آپ یہ سوچیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ الیکشنوں پر کانگریسی اپنے نمائندے کھڑے کریں گے۔ یہ کانگریسی نمائندے جلسے کریں گے، جلوس نکالیں گے، مسلمانوں کے محلوں میں جلوس نکالیں گے۔ اور مسلمان کیا کریں گے؟ مسلمان یہ جلوس نکلنے دیں گے۔ کیوں نکلنے دیں گے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیوں نکلنے دیں گے۔ مسلمان یہ ہندو کانگریس کے جلوس اس لیے نکلنے دیں گے کہ جلوس کے ساتھ وہی ہندو لڑکے ہوں گے جنھیں ہر صبح نماز سے پہلے میں دریا پر ورزش کرتے دیکھتا ہوں۔ وہی ہندو لڑکے ہوں گے جلوس کے ساتھ۔ یہ

لڑکے ورزشی ہوں گے۔ آپ مسلمان، میرے مسلمان بھائی ورزشی نہیں ہوں گے۔ ہندو لڑکے بلوہ کرانے کے لیے پوری طرح تیار ہوں گے۔ آپ خوابِ خرگوش میں سوئے ہوں گے۔ یہ ہندولڑکے اپنا کام کرجائیں گے اور آپ کو خبر بھی نہیں ہوگی۔''

چوک والے کچھ سہم سے گئے مگر نھتوا اپنی کانی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا چونکا اور اس کا حزبِ مخالف کا جذبہ پھر بیدار ہوا۔ وہ بولا،''ہم کیوں خوابِ خرگوش میں سوئے ہوں گے؟ ہم وہ پٹائی کریں گے جو پٹائی کی شرط ہے!''

حنیف پہلوان، سائیں بھولے اور میاں محمد طفیل کی باچھیں کھل گئیں۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے،'' مہر جیون نے کہا۔

''پٹائی ایسی آسان نہیں، نھتو پہلوان!'' سائیں بھولے نے کہا۔

''پہلے ورزش کرو، تیاری کرو،'' حنیف پہلوان نے کہا۔

''تیاری تو کریں گے،'' رفیع نے کہا۔

بابو کرم داد کا دایاں پاؤں بدستور پنکھا جھل رہا تھا۔ وہ بولے،''بازوے حیدر بناؤ نا، بازوے حیدر!'' اور پھر خوش ہو گئے۔

میاں محمد طفیل کو محسوس ہوا کہ اس کا جلسہ کچھ پھیکا پڑا جارہا ہے۔ اس نے پھر جھک کر سائیں بھولے کے کان میں کچھ کہا اور سائیں بھولا اُچھلا اور پکارا،''ایک نعرۂ حیدری!''

چوک والوں نے پکار کا جواب دیا،''یا علی!''

''میاں محمد طفیل!'' سائیں نے نعرہ لگایا اور چوک والوں نے بخوبی اس کا جواب

دیا، ''زندہ باد!'' مگر میاں محمد طفیل نے محسوس کرلیا کہ اب بات آگے نہیں چل پائے گی۔

''تو برادرانِ اسلام!'' میاں محمد طفیل نے بہر حال جلسہ جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''برادرانِ اسلام! یہ نہ بھولیے کہ اب، جیسا کہ میرے دوست حنیف پہلوان نے آپ کو بتایا ہے، اب آپ کے نزدیک ہی ارجن نگر میں گرنتھیوں نے بنارس سے استاد منگوایا ہے...''

حسّے نے میاں محمد طفیل کو تقریر جاری نہ رکھنے دی اور بولا، ''بہت دیکھے ہیں جی بنارس والے! وہ ایک بابو رام بھی آیا تھا، کیوں حنیف پہلوان؟'' اس نے حنیف پہلوان کو تقریر میں مخل ہونے پر مجبور کر دیا۔

''وہ کون تھا بابو رام؟'' نورے نے پوچھا۔

''تھا ایک جیب کترا،'' حنیف پہلوان نے کہا۔

''جیب کتروں کا استاد تھا رفیع پہلوان،'' حسّے نے کہا۔ ''کیا بتاؤں تمھیں کیا نام تھا اس کا۔ کیوں حنیف پہلوان؟''

میاں محمد طفیل نے دیکھا کہ تقریر آگے نہیں چل سکتی۔ وہ میدان چھوڑ کر بنچ کی پشت پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد بابو کرم داد کے برابر آ بیٹھا جو ابھی تک اپنے پاؤں سے پنکھا جھل رہے تھے۔

''بابو رام بنارسی سارے پورب میں استاد مانا جاتا تھا، پہلوان،'' حسّے نے کہا۔ ''بڑا نام تھا اس کا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کا نام ولایت تک گیا۔ لاٹ صاحب نے بھی اسے بلا کر دیکھا تھا۔ وہ بات سنا دو نا اس کی، حنیف پہلوان۔ وہ مہر یارے کی دکان

والی!'' حسّے نے حنیف پہلوان سے کہا، مگر حنیف پہلوان اس دخل در معقولات سے کچھ برہم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا، ''تم ہی سنا دو نا۔'' سب لوگ حسّے سے کہنے لگے کہ ہاں، تم ہی سناؤ۔ حسّا مان گیا۔

''مہریارے کی دکان تو تم جانتے ہو، لال کنویں کے برابر، موچی دروازے کے اندر۔ یہاں بیٹھے تھے شام کو حنیف پہلوان اور مختار کوکین والا اور دوسرے لوگ تھے۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ مختار کے برابر ایک گڑیا سا آدمی بھی بیٹھا تھا۔ یہ تھا بابو رام۔ سر پر کالی مخمل کی ٹوپی اور انگلیوں میں یہ موٹے موٹے زمرد کے نگینوں والی انگوٹھیاں۔ مختار ہیرے پہلوان کی بات کر رہا تھا، کہہ رہا تھا کہ جو ہاتھ کی صفائی ہیرے پہلوان کی دیکھی ہے، کہیں اور دیکھی ہے نہ سنی ہے۔ بابو رام تاؤ میں آ گیا اور اٹھ کر مکان کے آگے ٹہلنے لگا، کہنے لگا، 'بڑا نام سنا ہے پنجاب والوں کا! بابو صاحب، یہ دیکھو، سب کے سامنے رومال کے کونے پر یہ مال باندھا ہے اور یہ کندھے پر ڈالا ہے۔ دیکھیں کس کی مجال ہے جو ہاتھ لگا جائے!' اور بابو رام بنارسی نے اپنے ریشمی رومال کے کنارے کوئی چیز باندھ کر کندھے پر ڈال لی اور لگا پھر ٹہلنے۔ ادھر گلی سے ہیرا پہلوان بھی آ رہا تھا۔ اس نے بابو رام کی بات سن لی تھی۔ آتے آتے وہ بس بابو رام سے چھو کر نکلا اور مہریارے کے تھڑے سے ایک کیلا اٹھا کر چھیلنے لگا۔ مختار نے کہا، 'ہیرے پہلوان! یہ ہے وہ بابو رام بنارسی جس کے کاٹے کا منتر نہیں ہوتا۔' 'اچھا جی؟' ہیرے نے کہا۔ 'اوقات تو اس کی ایک چوّنی نکلی ہے!' ہیرے کے منھ سے یہ کیا نکلا، بابو رام کا تو رنگ اڑ گیا۔ کندھے سے رومال اتار کر دیکھا تو اس کے کونے میں ابھی تک کچھ بندھا تھا، مگر ہیرے پہلوان نے کہا، 'بابو

رام جی، کھول کر بھی دیکھ لو۔' بابورام نے گرہ کھولی تو اس میں صرف ایک چھوٹا سا کنکر بندھا تھا۔ اِدھر ہیرے پہلوان نے مٹھی کھولی تو اس میں ایک چونّی تھی۔ بابورام بنارسی بوکھلا گیا، مگر ہیرے پہلوان نے اس کے پاس جا کر کہا، 'گھبرا نہیں بنارسی بابو، لے یہ کیلا کھا۔' بابورام نے کیلا پکڑ لیا اور کیلا لیتے ہوئے اس کا رومال گر گیا۔ ہیرے پہلوان نے پلٹ کر کہا، 'بنارسی بابو، اپنا رومال تو اٹھا لے۔' بابورام نے رومال اٹھایا تو اس کے ایک کونے میں پھر گرہ تھی۔ اس نے کھولی تو اس میں سے وہی چونّی نکلی جو ہیرے پہلوان نے سب کو دکھائی تھی۔''

سارے چوک والے واہ واہ کر اٹھے۔

''جادو کا کھیل کر رہا تھا؟'' فیکے نے پوچھا۔

''جادو کا کھیل نہیں، بیٹے،'' نتھو نے اسے سمجھایا، ''اپنے کسب دکھا رہا تھا۔''

''جیب کترنے کی شرط یہی ہے، حسّے پہلوان،'' اس نے حسّے سے کہا اور اپنی مونچھوں کو ایسے تاؤ دینے لگا جیسے یہ کام اس نے کر کے دکھایا ہو۔

''بنارسی بابو شاگرد ہو گیا ہو گا ہیرے کا؟'' نورے نے پوچھا۔

''شاگرد؟'' حنیف پہلوان نے جواب دیا۔ ''وہ تو اس دن سے ایسا بھاگا کہ پھر کبھی کسی نے اسے نہ دیکھا، نہ اس کا ذکر سنا۔''

''ہیرے پہلوان کی کیا بات تھی!'' مہر جیون نے کہا اور کوشش کی کہ باتوں کا رخ پھر فسادات کی طرف ہو جائے۔

''بمبئی کی لائن پر چلتا تھا،'' سائیں بھولے نے بتایا۔ ''ایک ایک مارواڑی

لاکھ لاکھ میں بیچا ہے اس نے۔''

''اخیر عمر میں کام چھوڑ دیا تھا اس نے۔ بس اسامی تاڑتا تھا اور کسی کے ہاتھ بیچ دیتا۔ آگے خریدنے والا جانے اور مارواڑی۔ خود تو ہمیں کسرت کراتا تھا۔ کہتا تھا، 'بچہ! ہاتھ پاؤں ہیں تو کما کر کھا۔ کتے کی روٹی نہ چھین!'' حنیف پہلوان نے پوری کوشش سے بات کی۔

''واہ!'' نتھو نے کہا۔ ''پہلوانی کی شرط یہی ہے، حنیف پہلوان۔''

''آج کل ایسے استاد کہاں ملتے ہیں،'' سائیں بھولے نے کہا۔ ''ایک حنیف پہلوان کی جان ہے جو یہاں ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ بچو، اٹھالو اس سے فیض جتنا چاہو۔ کل کو ایسا استاد نہیں ملے گا۔''

''پہلوان، تم بھی اکھاڑا شروع کرو،'' میاں محمد طفیل نے کہا۔ ''اُدھر یہ ہندو لڑکے کریں ورزش جتنی جی چاہے، تم اپنے لڑکے تیار کرو۔''

اب بات ٹھیک ڈھرّے پر آئی۔ مہر جیون نے یہ سن کر کہا، ''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

''فوج بناؤ،'' نتھو نے کہا۔ ''ایسی ڈرل کراؤں گا جو ڈرل کی شرط ہے۔''

سب لوگ ہنس دیے۔

''تم زمین دو نا مہر جی اپنے کنویں کے پاس،'' میاں محمد طفیل بی اے نے مہر جیون سے کہا۔

''ہاں!'' سائیں بھولے نے کہا۔ ''لال بادشاہ کی درگاہ پر اکھاڑا بن جائے۔''

بیٹھے بٹھائے میاں محمد طفیل لیڈر بن گیا تھا۔ حنیف پہلوان اور سائیں بھولے کی

کئی ہفتوں کی محنت پھل لا رہی تھی۔ میاں محمد طفیل اس شام کے جھٹپٹے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا جلوس نکلا ہے اور وہ گینڈے اور حسّے، نتھو اور بلہڑ، رفیع اور نورے، حاکم اور فیکے کے کندھوں پر ٹاؤن ہال پہنچ رہا ہے۔ سائیں بھولا دیکھ رہا تھا کہ بسنت کے روز لال بادشاہ کی درگاہ پر عرس ہو رہا ہے اور درجنوں پہلوان کشتیاں لڑ رہے ہیں اور روپیہ چھنا چھن اس کی جھولی میں آ رہا ہے۔ حنیف پہلوان دیکھ رہا تھا کہ اس کے کاروبار میں اس کے دست و بازو چاروں طرف جمع ہو گئے ہیں۔

''یہ ٹھیک ہے،'' مہر جیون نے کہا۔ ''اکھاڑا بنا لو۔''

''میں تم کو وہ ورزش کراؤں گا جو ورزش کی شرط ہے،'' نتھو پھر بولا۔ اتنے میں اس کی صحیح آنکھ پھر بند ہو گئی اور وہ دور دراز دیکھنے لگا۔

اگلے ہی روز سائیں بھولے نے گلے میں ڈھول ڈال لیا اور شماں ایک بانس پر بہت سی رنگ برنگی پگڑیاں باندھے اس کے برابر چلنے لگا۔ سائیں بستی بستی پھرا اور لوگوں کو مطلع کرنے لگا کہ فلاں روز حنیف پہلوان کا اکھاڑا شروع ہو گا اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہاں آ کر ورزش کرے۔

7

اگر میاں محمد طفیل سمجھا کہ اس کی تقریر کا اثر ہوا ہے، سائیں بھولا سمجھا کہ ہیرے پہلوان کے مقولے نے کام کیا ہے، یا حنیف پہلوان اسے اپنی محنت کا پھل سمجھا، تو تینوں غلط سمجھے۔ نور پور میں کہیں چھڑکاؤ کر کے دری بچھا دو، رنگ برنگی جھنڈیاں لگا دو، کرسیاں سجا کر رکھ دو، فوراً ساری بستی تماشا دیکھنے جمع ہو جائے گی، اور جب ساری خلقت کو معلوم تھا کہ اکھاڑے پر لڈو بھی بانٹے جائیں گے تو یہاں رونق کیوں نہ ہوتی۔

اکھاڑے کے ایک کنارے سب سے چمکدار چیز نتھو کا بینڈ تھا۔ اس کے تمام ساز براسو سے چمکائے گئے تھے۔ بلہڑ کی تھالیاں سونے کی معلوم ہوتی تھیں، فیکے کے دھوتو والے باجے کا عکس دور دور تک پڑتا تھا۔ نتھو عام سنٹی کے بجائے نہایت خوبصورت بید بغل میں دبائے تھا۔ اس کے ایک کنارے پر چاندی کا خول چڑھا تھا اور اس پر کسی ولایتی فوجی دستے کا نشان کندہ تھا۔ نتھو کہتا تھا کہ یہ جہانگیر کے بینڈ کا نشان ہے، مگر اس کی ایسی باتوں پر کبھی کسی نے یقین نہیں کیا تھا۔ حسّے، بلہڑ اور شمے نے اسی صبح سر منڈوائے تھے اور اوپر تیل کی پوری پوری بوتل کی مالش کر کے خوب چمکائے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ان کے سر بلّور کے بنے ہیں، صرف شیشہ ذرا گہرا تھا۔ بھولے نے شمے کے لیے سبز رنگ کا چغہ بنوایا تھا اور گلے میں ڈالنے کے لیے چار پانچ نئی مالا لا کر دی تھی۔ نتھو کی سلمہ ستارے

والی سیاہ واسکٹ فیکے نے پہنی تھی۔ یہ اسے کوٹ کا کام دے رہی تھی لیکن بھلی معلوم ہوتی تھی۔ بینڈ اور بینڈ والے مناسب سج دھج کے ساتھ دو چار پائیوں پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ میاں محمد طفیل کی تشریف آوری کی خبر پہنچے اور یہ استقبالیہ دھن بجانا شروع کر دیں۔

بینڈ والوں کے برابر حنیف پہلوان اور مہر جیون ایک بہت بڑے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ پلنگ کے پائے فیل پا کے بیمار معلوم ہوتے تھے اور تیل کی مالش سے چمک رہے تھے۔ اسی پلنگ پر ایک ٹوکرا لڈوؤں سے بھرا رکھا تھا اور اس کے اوپر سبز اور سرخ باریک کاغذ بندھے تھے۔ ایک اَور گٹھڑی میں مشہدی لُنگیوں کے جوڑے تھے۔ حنیف پہلوان اور مہر جیون سفید بوسکی کی قمیض پہنے اور سفید چادریں باندھے تھے۔ مونچھیں مکھن سے تر تھیں اور بڑے بڑے صافے اوپر ڈول رہے تھے۔ اپنے خیال میں وہ بڑے باوقار انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے مگر بینڈ باجے کے برابر وہ سرکس کے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔

حنیف پہلوان اور مہر جیون کے پلنگ کے برابر ایک آرام کرسی میاں محمد طفیل بی اے کے لیے رکھی تھی۔ اس پر حنیف پہلوان کی بیوی کے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے غلاف والا گدا تھا۔ غلاف پر کم و بیش تمام بنیادی رنگوں سے پھول بوٹے کاڑھے گئے تھے۔ شاخیں کہیں سبز تھیں تو کہیں سرخ اور پتے کہیں نیلے اور کہیں پیلے۔ کوئی پھول گلاب کا معلوم ہوتا تھا تو کوئی نرگس کا، اور ان بیلوں کے بیچوں بیچ انگریزی حروف میں ''مائی ڈارلنگ'' لکھا تھا۔ اس آرام کرسی کے برابر کئی ایک کرسیاں دفتری قسم کی تھیں جن کی

پشتوں پر سے بید کی بنائی ٹوٹ جانے کے بعد لکڑی کے تختے جڑ دیے گئے تھے اور ان تختوں پر لال، نیلی روشنائی کے دھبے ہزار رگڑوں کے باوجود مٹے نہیں تھے۔ یہ کرسیاں معزز مہمانوں کے لیے تھیں — مثلاً مقامی تھانیدار کے لیے اور میونسپلٹی کے صدر محرر کے لیے، بابو کرم داد اور طالع مند کے لیے۔ نور پور کی مخلوق کے لیے اکھاڑے کے تین طرف رنگ برنگی جھنڈیوں کے سائے میں دریاں بچھا دی گئی تھیں اور جہاں یہ پٹی دار دریاں چھوٹی پڑ گئی تھیں وہاں اللہ کی زمین پر بیٹھنے والوں کے لیے جگہ بن گئی تھی۔

سائیں بھولے کی کوٹھڑی کے قریب کئی ایک پہلوان ایک دوسرے کو مالش کر رہے تھے۔ دو ایک اپنے طور پر ڈنڈ بیل رہے تھے۔ نور پور کے بچے کبھی ان پہلوانوں کے گرد جمع ہو جاتے، کبھی ایک ساتھ سب کے سب بھاگ کر کرسیوں پر بیٹھ جانے کی کوشش کرتے اور کبھی حنیف پہلوان اور مہر جیون کے پلنگ کے گرد آ کر لڈوؤں کے ٹوکرے کو حریص نگاہوں سے تکنے لگتے۔ سائیں بھولا، ایک لمبا سا بید گھماتا، انھیں پہلوانوں کے گرد جمع ہونے سے روکتا، لڈوؤں کے قریب سے تتر بتر کرتا، کرسیوں سے اٹھاتا، گھیر گھار کر انھیں دریوں پر بیٹھنے پر مجبور کرتا پھرتا۔ ساری بستی کے کتے بھی اس گہما گہمی میں شریک ہونے کو بیتاب ہو رہے تھے۔ کبھی ننگے دھڑنگے پہلوانوں پر بھونکتے، کبھی بھاگنے والے بچوں کا تعاقب کرتے اور جب کوئی مرکزِ عمل نہ ملتا تو سائیں بھولے کو دور بیٹھے بیٹھے بھونکنے لگتے۔ سائیں بھولا جب ان کی ذرّہ نوازیوں سے بھنّاتا تو بید گھماتا ان کے پیچھے بھی بھاگتا، مگر یہ تھے کتے، اِدھر سائیں پلٹتا، اُدھر یہ پھر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔

میاں محمد طفیل کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی۔ بچے بے صبرے ہو رہے تھے۔ جب انھیں کوئی مشغلہ نہ ملا تو انھوں نے سوچا کہ چلو سر پر لگی جھنڈیاں ہی نوچو۔ ایک اُچھلا، دوسرے نے اسے دھکا دیا، اس پر دس پندرہ نے اچھل کر جھنڈیاں پکڑنے کی کوشش کی۔ سائیں بھولے نے دیکھ لیا۔ دور سے نہایت صحت مند قسم کی مغلظات بکتا، بید گھماتا بھاگا آیا اور ماسٹر عبدالغفور کو شکایت پہنچانے کی دھمکی الگ دینے لگا۔ ماسٹر عبدالغفور نے عین نوازش سے یہ جھنڈیاں سائیں کو مستعار دی تھیں تاکہ اس موقعے پر قوم کا خرچ زیادہ نہ آئے۔ یہ سکول کی ملکیت تھیں اور سارا سال ایک ٹرنک میں بند رہتی تھیں۔ جب سال کے سال انسپکٹر کے دورے کی خبر آتی تو ماسٹر عبدالغفور تمام بچوں کو ایک ایک آنہ لانے کا حکم سناتا اور پچاس ساٹھ آنے جمع کر کے یہ جھنڈیاں ٹرنک سے نکال کر سکول کو سجا لیتا تھا۔ اس کی سالانہ آمدنی کی یہ ایک مد تھی اس لیے وہ جھنڈیوں کا بہت دھیان رکھتا تھا اور کبھی کسی کو شادی بیاہ کے موقعے پر بھی نہیں دیتا تھا۔ اگر وہ دیکھ لیتا کہ اس کی جھنڈیاں یوں نوچی جا رہی ہیں تو غش کر جاتا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی آیا نہیں تھا، اور اس سے بڑی خوش قسمتی اس کی یہ کہ بچوں کے والدین نے سائیں بھولے کا ساتھ دیا، اور یہ کہ جھنڈیوں کی لُوٹ کا فتنہ جلدی فرو کر دیا گیا۔

رانجھا حجام سرخ رنگ کا لنگوٹ پہنے تھا۔ اسے رفیع پان والا اور نورا دودھ والا مالش کر رہے تھے جو خود صرف لنگوٹیاں باندھے تھے۔ ان کے پاس باقاعدہ قسم کے پہلوانوں والے لنگوٹ نہیں تھے۔ نورے نے تو وہی لنگوٹی دھلوا لی تھی جسے پہن کر وہ گرمیوں میں کڑاہیاں مانجھا کرتا تھا اور رفیع کہیں سے کسی اَور کی مانگ لایا تھا۔ یہ دونوں

محض حنیف پہلوان کو خوش کرنے کے لیے دو دو روپے کے لنگوٹ خریدنے کو تیار نہیں تھے۔ حالانکہ حنیف پہلوان نے اعلان کروا دیا تھا کہ وہ کئی لڑکوں کو پاؤ بھر روز کا دودھ اپنی جیب سے پلوایا کرے گا اور رفیع اور نورے کو مکمل امید تھی کہ دودھ نورے کی دکان ہی سے جایا کرے گا، تاہم یہ اعلان ایسا قابلِ اعتماد نہ سمجھا گیا کہ نورا اس کے پیشِ نظر دو روپے لنگوٹ پر صرف کر دے۔ رفیع بہرحال ورزش کے حق میں نہیں تھا؛ وہ اپنی صلح کل طبیعت نہیں بدل سکتا تھا اور صرف قوم کا ساتھ دے رہا تھا۔

ان تینوں کے قریب معراج نتھ والا ڈنڈ پیل رہا تھا۔ یہ سچ مچ کا پہلوان معلوم ہوتا تھا اور اٹھک بیٹھک کرتے زور زور سے ''ہوں ہوں'' کرتا تھا۔ نتھ والا اسے اس لیے کہتے تھے کہ اس کی ناک چھدی ہوئی تھی اور اس کے والدین نے بچپن میں اس کے ناک میں بالی ڈال دی تھی تاکہ نظرِ بد اسے پہچان نہ سکے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی اور اس طرح یہ نظرِ بد کی زد سے بچا رہے۔ یہ مائی خیری کی بھٹی کے قریب تندور تپاتا تھا اور نور پور کے کم از کم آدھے گھروں کی روٹیاں لگاتا تھا۔ باقی گھروں کا آٹا جمال دین کے تندور پر جاتا تھا۔ وہاں جانے والے اپنی خوشی سے نہیں جاتے تھے بلکہ محض اس لیے کہ معراج نتھ والے کے ہاں بہت بھیڑ رہتی تھی اور ذرا دیر سے آنے والوں کی باری آتے آتے سہ پہر ہو جاتی تھی، چنانچہ جمال دین کی بدمزاجی، روٹیاں جلا دینے یا کچی ہی اتار ڈالنے کی عادت کے باوجود بہت سے لوگوں کو اس کے تندور پر جانا ہی پڑتا تھا۔ یہ بڑے گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا اور اکھاڑے میں آ جاتا تو بھلے بھلوں کی شیخی جھاگ ہو جاتی مگر نور پور والوں کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ یہ سب کے سب لوگ جن کی یہ روٹیاں لگاتا تھا، لچے، لفنگے،

اٹھائی گیرے، جیب کترے، چور یا بھڑوے تھے، ان کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں تمام کی تمام فاحشہ، قحبہ، دلاّلہ، رنڈیاں تھیں، اور یہ رائے وہ علی الاعلان چوک میں کھڑے ہو کر ظاہر کرتا تھا۔ سائیں بھولے نے جب اسے بھی اکھاڑے میں آنے کی دعوت دی تو وہ اپنی گدّی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ساری خلقت کو مخاطب کر کے پوچھنے لگا:

''حنیف پہلوان کو اپنی بیٹیوں کے لیے کوئی سرکاری سانڈ ڈھونڈنا ہے جو دنیا بھر کو اکھاڑے میں لا کر امتحان کرتا ہے کہ کون سا جوان ٹھیک رہے گا؟''

سائیں بھولا اتنی دیر رکا بھی نہیں کہ سارا فقرہ سن لے؛ جنھوں نے سنا وہ خاموش رہے۔

بڑی بڑی پگڑیاں باندھے، سفید چادریں اور سفید قمیض پہنے اور وزنی تعویذ گلے میں لٹکائے تین پہلوان، پتنگ کی طرح ڈولتے، اکھاڑے میں آئے۔ حنیف پہلوان نے ان کا استقبال کیا۔ تینوں کے تمام انداز پہلوانوں والے تھے۔ ٹانگیں کمانوں کی طرح اور جسم کے بعض اعضا اس قدر ترقی یافتہ کہ زندگی کے عام کاروبار کے لیے بالکل بیکار ہو گئے تھے۔ آگے آگے صمد و کشمیری تھا۔ اس کے دونوں کان ٹوٹے ہوئے تھے اور قد کاٹھ وزن دار تھا۔ یہ ایسے چلتا تھا جیسے دونوں کا لیڈر ہو، اور اس کے پیچھے پیچھے حافظ اور دِینا بھی چلتے ہوئے بار بار اس کی طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے اندازہ لگا رہے ہوں کہ قائد کا مزاج کیسا ہے۔ ان دونوں کا صرف ایک ایک کان ٹوٹا ہوا تھا، دوسرا صحیح سلامت تھا، اس لیے ان کا رُتبہ لازماً کم تھا۔

ان ماہرینِ فن نے اکھاڑے میں پہنچ کر اس کا ایک چکر لگایا، گویا اس کی لمبائی،

چوڑائی اور گڈائی کا جائزہ لے رہے ہوں۔ یہاں پاؤں مارا، وہاں سے کنکر اٹھا کر اکھاڑے سے باہر پھینکا، اپنا ماتھا چھوا، کانوں کو ہاتھ لگایا اور پھر لال بادشاہ کے مزار کے قریب جا کر لنگوٹ پہنا، کپڑے اتارے، پھر ایک دوسرے کے لنگوٹ میں ہاتھ دے کر خوب کھینچا تانی کر کے دیکھا کہ ازار بند کمزور تو نہیں، اور مالش کرنے لگے۔

یہ تینوں گاڑی بان تھے، اپنی اپنی بیل گاڑی اور بیلوں کے مالک۔ یہ بی بی کے احاطے میں محض رہتے نہیں تھے بلکہ اس پر حکومت کرتے تھے۔ حنیف پہلوان نے انھیں خاص توجہ دی مگر ایسے کہ معلوم ہوتا رہے کہ وہ تو استاد ہے اور یہ تینوں اس کے عزیز شاگرد ہیں۔ جب یہ مالش کرنے کے بعد ورزش کر رہے تھے تو بار بار حنیف پہلوان کی نظریں ان کی طرف جاتی تھیں، کیونکہ صرف یہی تین آدمی ایسے تھے جو نہ صرف پہلوان نظر آتے تھے بلکہ واقعی تھے بھی۔

میاں محمد طفیل بی اے ابھی تک نہیں پہنچے تھے اور مجمع انتظار میں بیٹھا اِدھر اُدھر تفریح کے پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔ دور سے کسی لڑکے نے ماسٹر عبدالغفور کو آتے دیکھا۔ اس نے نئے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ فراک کوٹ گھٹنوں سے کچھ نیچے آ رہا تھا۔ سر پر بہت بڑی سیاہ مخمل کی ٹوپی تھی جو اس کے کانوں پر بوجھ بنی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی اور آنکھوں میں سرمہ۔ چہرہ تیل سے چمک رہا تھا۔ لڑکا چلآیا، "آ گئے!" باقی سب لڑکے سمجھ گئے کہ کس کا ذکر ہے اور سب نے مل کر "لو آ گئے! لو آ گئے!" کے نعرے ایسے لگانے شروع کیے جیسے ماسٹر عبدالغفور کا استقبال مائی خیری کی بھٹی پر کیا جا رہا ہو اور وہاں امینہ بھی بیٹھی ہو۔ ادھر بینڈ باجے والے اپنے سازوں کو رومال سے صاف کرتے، ایک دوسرے

بجا کر ان کا امتحان بھی کر رہے تھے۔ عین اس وقت جب لڑکے "لو آ گئے!" چلّا رہے تھے، فیکا اپنے بڑے ڈھوتو پر 'بھوں بھوں' بھی کر رہا تھا۔ اس پر حادثہ یہ ہوا کہ جونہی ماسٹر اکھاڑے پر پہنچا، فیکے کے ڈھوتو سے ایک بہت بلند 'بھوں' نکلی۔ کچھ لڑکے کھڑے ہو گئے۔ مجمع قہقہہ لگانے لگا، کتے بھونکنے لگے اور ماسٹر عبدالغفور، کہ بیک وقت حنیف پہلوان سے مصافحہ کرنے اور ایک کرسی پر براجمان ہونے کی کوشش کر رہا تھا، کرسی کا صحیح مقام نہ ڈھونڈ سکا اور دھڑام سے زمین پر آ رہا۔ لوگ اس کی مدد کو بھاگے۔ حنیف پہلوان اور مہر جیون اپنے پلنگ سے اٹھے۔ بینڈ باجے والے تماشا دیکھنے آئے۔ اس دھما چوکڑی میں کہیں شمے نے اپنے ٹرمپٹ پر ایک زبردست دُھن ایسی بجائی جیسے فوجی بگل بجا کر جمعیت جمع کر رہے ہوں۔ ماسٹر یوں بدکا کہ ایک بار اچھل کر اٹھا اور اکھاڑے کے عین درمیان آ گرا۔ سب لوگ اُدھر بھاگے۔ پہلوان بھی لپکے کہ ماسٹر کو سہارا دے کر اٹھائیں اور سب کی توجہ اس پر ایسی لگی کہ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ میاں محمد طفیل بی اے بمع ایک گُرز کے تشریف لے آئے ہیں۔ پہلے تو وہ مجمعے سے دور کچھ دیر کھڑے رہے کہ لوگ انھیں آتے دیکھ لیں اور ان کا استقبال باقاعدہ ہو، مگر جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو مجمعے کو چیرتے ہوئے بڑھے کہ "ہٹو! ہٹ جاؤ!" اور خود اپنے دستِ مبارک سے ماسٹر کو زمین سے اٹھالیا۔ اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑی، ٹوپی اٹھا کر دی، فراک کوٹ پر ہاتھ مارے، مگر جب ماسٹر کے چہرے پر ملے ہوئے تیل کی وجہ سے اس پر انچوں گرد چمٹی ہوئی دیکھی جو رومال سے اترتی تھی نہ تولیے سے، بلکہ رگڑنے سے چہرے کے مساموں کے اندر گھستی چلی جاتی تھی، تو میاں محمد طفیل بی اے بھی ہنس دیے۔ سارا مجمع ہنس دیا مگر حنیف

پہلوان نے سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ایک طرف ماسٹر عبدالغفور کو کرسی پر ایسے بٹھایا جیسے بلّی کے بچے کو احتیاط سے کہیں رکھتے ہیں، اور دوسری طرف گرج کر لوگوں کو ڈانٹا کہ ''جاؤ، پیچھے ہٹ جاؤ۔'' لوگ ذرا ہلے تو سائیں بھولے نے سنٹی گھماتے ہوئے سب کو دھکیلنا شروع کر دیا اور انھیں پیچھے ہٹتے چھوڑ کر کتوں پر لپکا اور انھیں ایک فرلانگ تک بھگاتا چلا گیا۔ پھر پلٹا اور تھو پر برس پڑا، ''بڑے بینڈ ماسٹر کے بچے آئے ہیں۔ تمھیں پلنگ پر بیٹھنے کے لیے بلایا ہے؟''

بینڈ والے اس دھما چوکڑی سے کچھ بوکھلا چکے تھے کہ دھن بجاتے وقت بلہڑ کے ہاتھ حرکت میں لانا بھول گئے۔ وہ منھ کھولے کھڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے باپ ڑلدو کو محسوس ہوا گویا اس کے بیٹے کو شراکت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ وہ بھاگتا آیا اور آ کر اس نے بلہڑ کے بازوؤں کو وہ جھٹکا دیا کہ بلہڑ منھ کے بل گرا، مگر چونکہ بازو حرکت میں آ چکے تھے، وہ لیٹا ہوا ہی تھالیاں پیٹنے لگا۔ اتنے میں میاں محمد طفیل بی اے اپنی اچکن کے تمام بٹن کھول چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ مجمعے پر قابو پایا جا چکا ہے، مگر بلہڑ کے گرنے اور تھالیاں پیٹنے سے ہجوم میں پھر انتشار پیدا ہو گیا اور اب کے خود سائیں بھولے کو میدان میں کودنا پڑا۔ اس نے بینڈ باجے والوں میں آ کر بلہڑ کو اٹھایا اور اس کے بازو تھامے اور چلّا چلّا کر سب کو خاموش کروایا۔ میاں محمد طفیل نے بھی دونوں بازو زور زور سے ہلا کر ہر ایک کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور تقریر کے لیے پینترا جمایا۔ بینڈ باجے والے اپنے اپنے سازوں کو چارپائی پر رکھ کر بیٹھ گئے۔ پہلوانوں نے اپنی اپنی نشست سنبھالی۔ سائیں بھولے نے اَور کہیں جگہ نہ پائی تو حنیف پہلوان کی چارپائی کے موٹے

سے پائے پر ٹک گیا اور ہجوم کو یوں دیکھنے لگا جیسے گورنر کے دربار میں تھانے دار صاحبان ہر ایک کو گھورتے رہتے ہیں کہ کوئی بدتمیزی کی بات ایسی نہ کر دے کہ گورنر صاحب یہ محسوس کرنے لگیں کہ اس ملک میں پولیس کا انتظام ٹھیک نہیں۔ بہر حال، میاں محمد طفیل نے جب دیکھا کہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے تو کھانس کھونس کر مجمعے کو مخاطب کیا،

''میرے بھائیو!...''

''اوئے چپ اوئے... چپ اوئے...'' کی آوازیں آئیں۔ یہ مجمعے کے لیے تھیں کہ جو ابھی خاموش نہیں ہوا تھا وہ غور سے سنے۔ میاں محمد طفیل بی اے نے اپنی تقریر شروع کی:

''میرے بھائیو!...''

سائیں بھولے نے سب کو سمجھا رکھا تھا کہ جب میں کہوں، ''میاں محمد طفیل صاحب'' تو تم سب مل کر کہنا ''کو یادرکھنا!'' اور جب میں کہوں ''نعرۂ تکبیر'' تو تم کہنا ''اللہ اکبر!''، اور جب کہوں ''حنیف پہلوان یالال بادشاہ'' تو تم کہنا ''زندہ باد!'' اس نے نتھو کو تاکید کر دی تھی کہ نعروں کے وقت بلہڑ کو مت بولنے دینا، کیونکہ ریہرسل کے وقت جب اس نے ''میاں محمد طفیل'' کہا تھا، بلہڑ نے ''اللہ اکبر'' کہہ دیا تھا۔ سائیں نے منع کیا تو بلہڑ نے پوچھا کہ سائیں نے نعرۂ تکبیر کیوں نہیں کہا۔ سائیں لاجواب ہو گیا تھا۔ بہر حال، متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ بلہڑ بہشتی خاموش ہی رہے تو بہتر ہے اور جہاں مجمع کہے ''کو یادرکھنا'' تو نتھو فوراً ڈھن بجائے۔

''میرے بھائیو!...'' میاں محمد طفیل نے کہا۔

''نعرۂ تکبیر!'' سائیں بھولا چلّایا اور سارے مجمعے نے کہا، ''اللہ اکبر!''

''میاں محمد طفیل!'' سائیں بھولا چلّایا۔ تمام کتے بھونکنے لگے اور مجمعے نے کہا، ''کو یاد رکھنا۔''

نتھو کو یاد تھا کہ جہاں ''کو یاد رکھنا'' آیا وہاں دھن بجانی ہے، اس نے فوراً لپک کر بلبڑ کے بازوؤں کو جنبش دی اور بینڈ باجہ ''کرنل بوگی'' کی دھن بجانے لگا اور کتے اور زور شور سے بھونکنے لگے۔ میاں محمد طفیل کو رکنا پڑا۔ سائیں بھولے نے لڈوؤں کا ٹوکرا اٹھا کر میاں محمد طفیل کے سامنے لا رکھا۔ لوگ لڈو دیکھ کر خوش ہو گئے۔

آخر کار میاں محمد طفیل کو موقع ملا کہ تقریر کریں۔ اس نے قوم کو ورزش کے فوائد سمجھائے اور آئندہ الیکشنوں میں میاں محمد طفیل بی اے کو ووٹ دینے کے فوائد آمیز نتائج سے آگاہ کیا کہ نور پور میں بجلی گھر گھر لگ جائے گی، گھر گھر پانی کا نل لگ جائے گا اور موریاں ایسے بنیں گی کہ کبھی کسی کو نظر نہیں آئیں گی۔ قریب تھا کہ نتھو سارے مجمعے کو اس بحث میں الجھا دیتا کہ روشنی ہو اور موری بنی ہو تو کیسے نظر نہیں آئے گی، کہ صمدو کشمیری، حافظ، دِینا اور معراج نتھ والا سامنے آ گئے اور انھوں نے اکھاڑے میں ایک ایک پاؤں رکھ کر ایک دوسرے کے کندھوں پر مٹی مَلتے ہوئے حنیف پہلوان کو مخاطب کر کے کہا:

''اجازت ہے، خلیفہ جی؟''

میاں محمد طفیل نے موقع پا کر گرز حنیف پہلوان کے ہاتھ میں تھمایا، ایک مشہدی لنگی اس کے سر پر اور دوسری مہر جیون کے سر پر باندھی، اور سائیں بھولے نے سب حاضرین میں لڈو بانٹنے شروع کر دیے۔ حنیف پہلوان نے اپنے ہاتھ سے لڈو صمدو،

حافظ، دِینے، معراج اور دوسرے لنگوٹ اور لنگوٹی پوشوں کو دیے اور ذرا امن وامان قائم ہوا تو پہلوانوں کو کُشتی کی اجازت دیتے ہوئے کہا:

''حکم اللہ کا ہے، بچّے!''

پہلوانوں نے کُشتی شروع کر دی۔ نتھو کا بینڈ باجہ نہایت خوفناک قسم کی دھن بجانے لگا اور نور پور کا اکھاڑا باقاعدہ شروع ہو گیا۔

8

گینڈا لال بادشاہ کی قبر کی اوٹ میں سب سے الگ تھلگ اکڑوں بیٹھا اکھاڑا شروع ہونے کی کارروائی میں کچھ اپنے ہی طور پر شریک تھا۔ سائیں بھولے نے اسے اس رسم میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی تھی۔ حنیف پہلوان، ورزش کے فوائد سب چوک والوں کو بتاتا تھا تو یہ بھی سنتا تھا مگر اسے خاص طور پر کسی نے کوئی تلقین نہیں کی تھی؛ بلکہ ایک بات ایسی ہوگئی تھی جس کی بنا پر گینڈا پہلوانوں اور ورزش کرنے والوں کی صف سے گویا خارج قرار دیا جا چکا تھا، اور اس نے یہ حیثیت ایک لحاظ سے قبول کر لی تھی۔

وہ واقعہ محض سرسری طور پر ہو گیا تھا، کسی نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ کہ چوک میں پہلوانی کے فن کی باتیں ہو رہی تھیں، داؤ پیچ گنوائے جا رہے تھے، کسی نے یونہی گینڈے کو مخاطب کر کے پوچھ لیا کہ ''جانتے ہو، دھوبی پٹڑا کیسے ہوتا ہے؟''

گینڈا ابھی سوال کرنے والے کی صورت ہی دیکھ رہا تھا، ہاں یا نہیں کہنے کا مسئلہ طے ہی ہو رہا تھا، کہ رفیع پان والا حسبِ دستور گینڈے کی وکالت کرنے لگا۔

''اس بیچارے کو کیا پتا، دھوبی پٹڑا کیا ہوتا ہے۔ یہ کوئی اکھاڑوں میں پہلوانی کرتا رہا ہے؟''

گینڈے نے رفیع پان والے کی طرف دیکھا اور محض رواداری میں اپنے آپ کو

بحث سے خارج کر لیا۔ اب ہندوؤں کے محلّوں میں ہنوٹ اور چو مکھی کی باتیں ہوں یا اکھاڑا ہونے کے دن جلوس اور دعوت کا ذکر ہو، گینڈا ان میں نہیں بولتا تھا، مگر سنتا سب کچھ تھا اور جو ہیجان آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا تھا اس کا اثر بھی قبول کرتا تھا۔ حنیف پہلوان جانتا تھا کہ رفیع پان والا، نورا دودھ والا، رانجھا حجام اور دوسرے دکاندار اکھاڑا شروع کرنے میں پیش پیش ہیں مگر باقاعدہ آ سکیں گے نہ اس کے کاروبار میں ممد ہو سکیں گے۔ انھیں اپنی دکانوں پر بیٹھنا ہوتا تھا اور سہ پہر کی گاہکی ہی چار پیسے لاتی ہے، باقی دن تو محض بیٹھنا ہوتا ہے کہ اڈہ نظر آتا رہے۔ پھر بھی اسے ان کی خوشنودی حاصل کرنا تھی تاکہ اکھاڑا سارے نور پور کا اکھاڑا کہلائے، ورنہ اصلی لوگ جو اس کے کام آ سکتے تھے، بالکل دوسرے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ حنیف پہلوان نے گینڈے کو بھی باقی چوک والوں کے ساتھ لپیٹ لیا اور اس کی طرف خاص توجہ نہ دی۔ گینڈے کو جب کوئی خاص پیشکش نہ کی گئی تو وہ بھی اکھاڑے سے بے تعلق ہو گیا۔ تاہم اکھاڑا شروع ہونے کا دن اس پر بہت بھاری گزرا۔

گینڈا صبح اٹھا اور چوک میں پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اذان سے بھی پہلے احاطے سے نکل آیا ہے۔ چاروں طرف اکھاڑے کے کاروبار کے سوا اسے کچھ نہ ملتا تھا۔ جسے پوچھو، اکھاڑا کھودنے گیا ہے۔ جو ملتا وہ اکھاڑے کے سلسلے میں کہیں جا رہا تھا یا کچھ لے کر آیا تھا۔ بھشتی سب اکھاڑے پر تھے۔ سکول کے بچے اور دوسرے لڑکے وہاں جھنڈیاں لگا رہے تھے، کرسیاں، چارپائیاں، چٹائیاں لے جا رہے تھے۔ رفیع نے بہت سے پان لگا رکھے تھے اور دکان کچھ زیادہ ہی سجائی تھی۔ ہر طرف صفائی ہو رہی تھی،

چھڑکاؤ کیے جا رہے تھے، ہر چیز سجائی جا رہی تھی، اچھا خاصا میلہ لگ گیا تھا۔ نورے کی دکان پر اسے برفی کے ڈھیر نظر آئے۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر کھانے لگا۔ دکانوں پر لگی جھنڈیاں اچھل اچھل کر پکڑنے لگا۔ کسی نے یہ کام بتایا، کسی نے وہ، اور گینڈا کام کرتے کبھی تھکا نہیں تھا۔ دن بھر رونق میلے کا مزہ لیتے وہ سہ پہر تک نور پور کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ اکھاڑا دیکھ آیا تھا، اس کی مٹی بھی دیکھ آیا تھا کہ نرم ہے۔ سہ پہر کو جب ساری خلقت اکھاڑے پر جمع ہوئی تو گینڈا بھی وہاں پایا گیا مگر کسی نے ہجوم کو پیچھے ہٹنے کی تلقین کی تو گینڈے کو جیسے یکدم احساس ہوا کہ وہ ورزش کرنے والوں اور پہلوانوں کی صف سے باہر ہے۔ وہ مڑا اور اپنے طور پر سارے نور پور کا ایک چکر لگا کر مہر جیون کے احاطے کے پچھواڑے سے آ کر لال بادشاہ کی قبر کی اوٹ لے کر بیٹھ گیا۔

ڈوبتے سورج کی روشنی لحظہ بہ لحظہ بدلتی تھی — کبھی سرخ ہو جاتی، کبھی سنہری اور کبھی زردی مائل۔ صمد وکشمیری، حافظ، دِینے اور دوسرے ورزش کرنے والوں کے گٹھے ہوئے جسم تیل کی مالش سے چمکتے اسی روشنی کے رنگوں سے روپ بدلتے، کبھی تانبے کے بنے ہوئے بت معلوم ہوتے، کبھی پتے کمہار کے آوے میں پکتے برتنوں کی طرح، کسیلے پیتل کی طرح نظر آتے، اور کبھی محسوس ہوتا کہ خود ان میں سے روشنی نکل رہی ہے۔ گینڈا ان کے بدلتے رنگ دیکھتا اور اس نظارے میں خود اس کی ہستی اسے صیقل ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

جب پہلوان اکھاڑے میں اترے تو گینڈا بھی گویا ان کے ساتھ ورزش کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کسی ایک کا عکس بن جاتا اور جیسے وہ اکھاڑے میں لپکتا، بچتا، گتھم گتھا

ہوتا، جوڑتا توڑتا، گینڈا بھی بیٹھے بیٹھے کُشتی کرتا، مٹھیاں کس کس کر زور لگاتا اور سانس روک کر کبھی تو ایسا چلتا کہ دھڑام سے گرتا۔ کشتیاں دیکھنے والے لوگ مزار کے پیچھے سے آواز آتی سن کر چونک اٹھتے اور مڑ کر دیکھتے۔ انھیں کچھ نظر نہ آتا۔ گینڈا لال بادشاہ کی قبر کے نزدیک بیٹھا پھر اچھلتا اور بیٹھ کر کشتی دیکھنے اور کرنے لگتا۔ خود ہی کئی ایک پٹخنیاں کھانے کے بعد گینڈا جب کسی پہلوان کو غور سے دیکھنے لگتا تو اسے محسوس ہوتا کہ پہلوان اپنی ٹانگوں پر ڈولنے لگے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے ہیں، جسم پھول گئے ہیں۔ وہ پھر زور لگاتا، قبر کو بڑی مضبوطی سے تھامتا، وہ اسے اپنی جگہ سے سرکتی معلوم ہوتی۔ یہ اس کے اَور قریب ہو جاتا اور دونوں بازو اس کے گرد ڈال کر خوب بھینچتا۔ اُدھر پہلوان گتھم گتھا ہو جاتے اور گینڈا ایک کو گرانے کی ترکیب کرتا کرتا قبر سے لڑھک جاتا۔ وہاں سے پلٹتا اور پھر کشتی میں شریک ہو جاتا۔ یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہتا۔ جوں جوں روشنی مدھم ہوتی گئی، اکھاڑے کے پہلوان اپنی شکل صورت بھی کھوتے گئے اور آہستہ آہستہ محض بے ڈول سے ستون بن گئے جو ایک دوسرے سے ٹکراتے اور، جیسے ربڑ کے بنے ہوں، اپنی ٹکر سے خود ہی پیچھے ہٹتے، پھر آگے بڑھتے اور ٹکرا کر پیچھے گرتے۔ اکھاڑے کے چاروں طرف بیٹھا ہجوم ان کے گرد گھومنے لگا۔ خود اکھاڑا بھی گھومنے لگا اور لال بادشاہ کا مزار تو اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ گینڈا اسے ہزار مضبوطی سے پکڑتا مگر وہ ایسا جھٹکا دیتا کہ گینڈا دو چار قدم پیچھے آ گرتا۔ چارپائیاں، کرسیاں، بینڈ باجہ، یہ سب چیزیں اچھلنے کودنے لگیں اور گھوم گھوم کر زمین پر آنے لگیں۔ گینڈے نے پورا زور لگایا کہ کائنات کو تھام کر رکھے، مگر کائنات خود اس کو گھمنیاں دینے لگی۔ جیسے

وہ دن بھر پنگھوڑوں میں بیٹھا رہا ہو، سارا ماحول گھومتے گھومتے اسے گرانے پر تلا ہوا معلوم ہونے لگا۔ ہجوم شور مچانے لگا۔ بینڈ باجہ پورے زور سے بجنے لگا، رنگ برنگی جھنڈیاں ناچنے لگیں اور سارا نور پور، پنگھوڑوں پر بیٹھا ہوا، ہوا میں گھومنے لگا۔ گینڈے کے پاؤں کے نیچے سے زمین خود بخود سرکنے لگی۔ اگر مزار کو تھامتا تو زمین نیچے سے نکل جاتی، اگر پاؤں جما کر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو نور پور کہیں جانے لگتا۔ اس مخمصے میں کہ کس کو تھامے، کس کو جانے دے، گینڈا خواہ مخواہ کی پٹخنیاں کھانے لگا۔ پہلوان اس کے قابو سے باہر ہو گئے، کائنات اس کی مہم سے باہر ہو گئی۔ آخر کار پریشان ہو کر اٹھا، مگر منہ کے بل گرا۔ ہمت کر کے پھر اٹھ بیٹھا۔ ابھی اٹھ کر بیٹھے کوئی آدھا منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ گینڈے کو کچھ گرم گرم شے اپنے اوپر کے ہونٹ پر محسوس ہوئی جو بہہ کر منہ میں آنے لگی۔ اس نے قمیض کی آستین سے ناک پونچھی۔ آستین سرخ ہو گئی۔ اس نے آستین کو دیکھا اور پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ کائنات ابھی گھوم رہی تھی۔ اس نے پھر محسوس کیا کہ ناک چل رہی ہے۔ خون کے قطرے اب ٹپ ٹپ اس کے کُرتے پر گرنے لگے تھے۔ اس نے پھر ناک صاف کی اور تمام آستین اور دامن خون سے رنگ لیا۔ گینڈے نے قمیض اتار لی اور اسے تہہ کر کے ناک کے اوپر رکھ لیا۔ چند لمحوں کے بعد پھر دیکھا تو اس پر بہت بڑے زخم کی طرح ڈوبتے سورج کی شکل کا گول اور سرخ دائرہ بنا تھا، مگر کائنات کی گھومنیاں ابھی کچھ مدھم پڑ رہی تھیں۔ وہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ناک کے اوپر قمیض رکھ کر منہ سے لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ یہ اس نے بچپن میں خانہ بدوشوں سے سیکھا تھا جو اس کے کام آیا۔

معلوم نہیں گینڈا کتنا عرصہ اسی طرح لیٹا رہا۔ اکھاڑے کا شور دھیرے دھیرے بہت سی باتوں کا ہجوم معلوم ہونے لگا۔ باتیں گینڈے کی سمجھ میں آنے لگیں۔ زمین اپنی جگہ پر قائم معلوم ہوئی۔ بینڈ باجے کی دھن سنائی دینے لگی، کتے بھونک رہے تھے، مگر ہر چیز اس سے دور جاتی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر لال بادشاہ کی قبر سے اٹھایا۔ سامنے اکھاڑے کے چاروں کونوں پر چار چراغ جلتے دکھائی دیے اور ان کی روشنی میں روندا ہوا اکھاڑا یوں نظر آیا جیسے سیلاب کے دنوں میں دریا کا پانی ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ یہ منظر اس قدر ہیبت ناک تھا کہ اگر گینڈا باقی لوگوں کے برابر پہنچنے کی کوشش نہ کرتا جو جلوس کی صورت میں چوک کو جا رہے تھے تو ایک منٹ میں اسے یہاں جنات کا ناچ دکھائی دینے لگتا۔

9

پروگرام کے مطابق سب لوگ ایک جلوس کی شکل میں اکھاڑے سے حنیف پہلوان کی بیٹھک کی طرف چلے جہاں میاں محمد طفیل بی اے، مہر جیون، سائیں بھولا اور حنیف پہلوان نے رسمی دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ حنیف پہلوان کے اشارے پر نتھو اٹھا۔ اس نے اکھاڑے کے قریب اپنے بینڈ باجے کو ترتیب دیا۔ بلہڑ بھشتی کو اس کی جگہ پر کھڑا کیا۔ باقی باجے والوں کو سر سے پیر تک اس طرح دیکھا جیسے جرنیل اپنی فوج کا معائنہ کرتے ہیں۔ اِس کے باجے کا منھ ذرا اوپر کو اٹھا دیا، اُس کے ڈھول کو ہلا کر دیکھا کہ ٹھیک ٹھاک ہے، ٹرمپٹ کے منھ کے اندر دیکھا کہ اندر سے بھی چمکتا ہے کہ نہیں، اور پھر سب کے آگے جا کھڑا ہوا۔ کلارنٹ کی تمام سُریں ترتیب سے بجائیں۔ بینڈ باجے کی طرف منھ کر کے دونوں ہاتھ اٹھائے۔ انھیں تین مرتبہ جنبش دے کر کہا، ''ون... ٹو... تھری!'' اور بھاگ کر بلہڑ بھشتی کے بازو ہلا دیے۔ خود اپنی جگہ واپس آ کر 'اباؤٹ ٹرن' کیا اور لیفٹ رائٹ کرتا چلنے لگا۔ عین ممکن تھا کہ جلوس بننے نہ پائے اور بینڈ باجہ مارچ کرتا صرف کتوں کا ایک دستہ لیے حنیف پہلوان کی بیٹھک پر پہنچ جائے، مگر سائیں بھولے نے ہمت کی اور بھاگم بھاگ کرتا بینڈ ماسٹر نتھو تک پہنچا۔ اسے سمجھا بجھا کر سارے بینڈ باجے کو موڑ کر واپس لایا۔ جو کتے ہجوم کو چھوڑ بینڈ کے پیچھے جانے کے لیے تیار ہو رہے

تھے وہ بھی واپس آ گئے اور سائیں بھولے نے انھیں دور بھگا دیا۔

نتھو کی اس حرکت سے سب لوگ جلدی جلدی اٹھ کر بینڈ کے پیچھے کھڑے ہونے لگے اور سائیں بھولے کے اشارے پر نتھو نے دوبارہ ''ون... ٹو... تھری!'' کیا، اور جلوس چلا۔

پہلی صف میں دائیں میاں محمد طفیل بی اے، بائیں مہر جیون اور ماسٹر عبدالغفور اور بیچ میں حنیف پہلوان گُرز رکھے تھا۔ کھڑے ہوتے اس نے اپنی مونچھوں کو ایسے تاؤ دیا جیسے اس کی تصویر اترنے والی ہو۔ ان کے پیچھے صمد و کشمیری، حافظ اور دِینا، معراج نتھ والا اور دو چار پہلوان تھے جو دوسری نواحی بستیوں سے آئے تھے۔ انھیں چوک میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ صمد وغیرہ سے ان کی واقفیت تھی اور حنیف پہلوان ان کو خاص توجہ دے رہا تھا۔ ان کے پیچھے رفیع، نورا، رانجھا اور چوک کے دوسرے لڑکے تھے اور باقی جلوس محض ایک ہجوم کی صورت میں تھا۔ نہ صفیں تھیں نہ قطاریں، بس جیسے جس کا جی چاہا آ کھڑا ہوا۔ بچے بھاگتے بھاگتے کبھی آ جاتے، کبھی جلوس سے باہر ہو جاتے اور کبھی پیچھے مڑ کر درجنوں کتوں کو بھگانے لگتے جو بھونکتے بھونکتے اگلی صفوں تک بلکہ بینڈ باجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوتے۔ سائیں بھولا جلوس کے ہمراہ اسی حیثیت سے تھا جیسے سیاسی جلوس میں پولیس والے ہوتے ہیں — کبھی بھاگم بھاگ آگے اور کبھی سنٹی لیے کتوں کے پیچھے، کبھی بچوں کو گالیاں دیتا کہ قطار میں رہیں، کبھی بوڑھوں سے لڑتا کہ جلوس سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔

جلوس ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ ''ٹھہرو، ٹھہرو'' کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ حنیف

پہلوان سے شروع ہوئیں اور جلوس کی دُم تک، عین کتوں تک پہنچیں۔ ماسٹر عبدالغفور حنیف پہلوان کے حکم سے بھاگتا ہوا آگے گیا اور نتھو کو رکنے کے لیے کہا۔ نتھو نے کلارنٹ منھ سے نکال کر ماسٹر عبدالغفور کو بے نقط گالیاں دینا شروع کر دیں۔ نتھو کو شاید بھوک زیادہ لگ رہی تھی اور وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال، سب باجے والے رک گئے مگر بلہڑ تھالیاں بجاتا کہیں کا کہیں نکل گیا۔ شماں اس کے پیچھے بھاگا اور اسے پکڑ کر لایا۔ حنیف پہلوان نے چلّا کر غضبناک آواز میں سائیں بھولے کو بلایا۔ سائیں بھولا ہانپتا کانپتا حنیف پہلوان کے سامنے پیش ہوا۔ نتھو سب کو گالیاں دینے لگا۔ سائیں نے اس سے درخواست کی کہ خاموش رہے اور حنیف پہلوان کی بات سنے۔

''ہار!'' حنیف پہلوان چنگھاڑا۔ طے یہ پایا تھا کہ اہالیانِ نور پور سب پہلوانوں کو اپنی خوشی سے ہار پہنائیں گے اور یہ ہار حنیف پہلوان نے منگوا کر سائیں بھولے کو دے رکھے تھے کہ جونہی جلوس تیار ہو، کچھ معززین آگے بڑھیں اور سب کے گلے میں ہار ڈالیں۔

''سائیں، ہار کہاں گئے؟'' نتھو نے بگڑ کر پوچھا۔ اب وہ سمجھا تھا کہ اسے کیوں روکا گیا تھا۔ ''یہ لوگ اتنی اہم بات بھول کیوں جاتے ہیں۔''

''ہار...'' سائیں بھولے نے کہا اور اچھل کر اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگا۔ وہ معززین کا انتظام کرنا بالکل بھول گیا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے صرف دو درجن بچے اور چار درجن کتے بھاگنے لگے اور پھر سب لوگ ''ہار! ہار!'' پکارنے لگے۔ ہر شخص کو غصہ آ رہا تھا کہ سائیں بھولا کتنی بدانتظامی کا مرتکب ہوا ہے۔ ان کا بس چلتا تو اسے جان سے مار

دیتے مگر وہ ہاروں کی خوشبوؤں کا خیال کر کے اسے معاف کر دینے کی کوشش کرنے لگے۔ نتھو پھر سب کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا۔

معززین میں سے تو کوئی نہیں آیا البتہ خود سائیں بھولا ایک ٹوکری بغل میں دبائے آ گیا اور حنیف پہلوان کے برابر پہنچ کر ٹوکری پر بندھا دھاگا کھولنے میں الجھ گیا۔ باقی ٹوکریاں بچے اٹھا کر لائے تھے۔ وہ ہجوم میں گھس گئے۔ ایک ٹوکری اِدھر کھسکی ایک اُدھر، دس آدمی اِس پر لپکے پندرہ بچے اُس پر، کسی نے ہار اِدھر کھینچے کسی نے اُدھر۔ آدھے ٹوٹ گئے، آدھے بکھر گئے۔ کسی کے حصے میں چار آ گئے اور کسی کے حصے میں مٹھی بھر مَسلے ہوئے پھول۔ اِس کے پیچھے وہ بھاگا، اُس نے گالی دی، اِس نے مکّا رسید کیا۔ ''مجھے دے بے!'' ''بہت بڑے باپ کے ہیں!'' جلوس بلوے کی صورت اختیار کرتے کرتے بچا۔ مہر جیون چلّایا کہ ''خاموش!'' میاں محمد طفیل نے تقریر کرنے کا موقع پا کر مسلمانوں کی بدتنظیمی کا رونا رو دیا۔ چاروں طرف سے ''خاموش! خاموش!'' کے نعرے بلند ہوئے۔ سائیں بھولا اِدھر بھاگا، اُدھر چلّایا، مجمعے پر قابو پا کر نتھو کو چلنے کا اشارہ کیا کہ اگر جلوس پھر سے چلنے لگے، بینڈ بجنے لگے تو لوگ خود ہی خاموش ہو جائیں گے، مگر نتھو نے اشارے کی کوئی پروا نہ کی اور جما ہوا اپنی جگہ پر کھڑے کا کھڑا رہا۔ حنیف پہلوان یہ دیکھ کر آگے بڑھا اور نتھو سے کہا، ''نتھو پہلوان، اب چلو نا!'' مگر نتھو کے کان پر جوں تک نہ رینگی، بلکہ وہ غضبناک نگاہوں سے حنیف پہلوان، میاں محمد طفیل بی اے مہر جیون اور سائیں بھولے کو تکنے لگا۔

سائیں بھولے کی ٹوکری کے تمام ہار حنیف پہلوان، میاں محمد طفیل، ماسٹر

عبدالغفور اور خود سائیں بھولے نے پہن رکھے تھے اور خوشبو سے ساری فضا مہک رہی تھی۔ سائیں بھولے نے بڑھ کر نتھو سے کہا:

''کیا بات ہے؟ چلتے کیوں نہیں؟''

''ہماری ٹرف ڈیکھو،'' نتھو نے حکم دیا۔

سائیں بھولا گھبرا گیا۔

''ٹم نے ہم کو نہیں ڈیکھا؟'' نتھو نے پوچھا۔

''دیکھا... دیکھا کیوں نہیں؟'' سائیں بھولے نے کہا۔

''ٹو پھر ہار کڈھر ہے؟'' نتھو نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''ہار؟''

''ہار!''

چاروں طرف پھر ''ہار! ہار!'' ہونے لگا۔ اس پکار کے دوبارہ شروع ہونے سے سائیں کا کلیجہ دہل گیا۔ جلوس میں پھر دھینگا مشتی ہونے لگی۔ ایک نے دوسرے کا ہار کھینچا اور بھاگا۔ دوسرے نے گالی گلوچ شروع کر دی۔ اِس کے دھم سے لگی۔ اُس نے دوسروں کی ماں بہن سب گن کے رکھ دیں۔

''نتھو پہلوان کو ہار ملنا چاہیے،'' میاں محمد طفیل بی اے نے فیصلہ سنا دیا۔ نتھو چمک کر آگے آیا اور کہا، ''ہم کو پہلے ملنا چاہیے!''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں،'' میاں محمد طفیل بی اے نے کہا اور سائیں بھولے کو ڈانٹنا چاہا۔ سائیں نے سب کی طرف باری باری سے دیکھا۔ اپنا ہار اتار کر دینے کو اس کا جی نہ

چاہا۔ حنیف پہلوان، مہر جیون یا محمد طفیل سے ہار ملتا نظر نہ آیا۔ اس کی نگاہیں ماسٹر عبدالغفور پر جم گئیں۔ ماسٹر عبدالغفور ہاروں پر ہاتھ پھیرتا، سائیں کی نگاہیں بچاتا، دوسری سمت دیکھنے لگا۔ نتھو اس دیر سے تاؤ کھا گیا اور زیادہ رعب دینے کی غرض سے انگریزوں کے لہجے میں بولنے لگا:

''کیا ڈیکھتا سائیں بھولا؟ ہم بولا ہمارے واسطے ڈو ہار مانگٹا!''

سارا جلوس ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ہر بچہ دوسرے کو انگریزی لہجے میں گالی دینے لگا، اور سائیں بھولا ماسٹر عبدالغفور پر نگاہیں گاڑے پسینے پسینے ہو رہا تھا۔

''دیکھتے کیا ہو سائیں بھولا، اَور ہار لاؤ'' میاں محمد طفیل نے کہا۔

سائیں بھولا اَور ہار کہاں سے لاتا! ماسٹر عبدالغفور صف سے نکل کر ایک طرف جا کھڑا ہوا تھا کہ اس کا ہار نہ چھن جائے۔ سائیں نے باقی مجمعے میں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

''ٹم سنٹا نہیں بھولا؟ ہم ہار مانگٹا!'' نتھو پھر چلّایا۔

''او ٹھہر جا، صاحب کے بچے! ابھی لاتا ہوں'' آخر کار سائیں نے تنگ آ کر کہا اور پہلا شخص جو ہجوم میں ہار پہنے نظر آیا اس پر لپکا۔ اس نے سائیں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ جونہی سائیں قریب آیا، وہ شخص بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے اَور بہت سے لوگ بھاگنے لگے۔ کتوں کو موقع ملا، وہ سب کے سب ان کے پیچھے بھونکتے بھاگنے لگے۔

میاں محمد طفیل بی اے نے جب دیکھا کہ معاملہ کسی طور نہیں سلجھتا تو ماسٹر عبدالغفور کے پاس خود چلا گیا اور درخواست کی کہ وہ اپنے ایک درجن ہاروں میں سے ایک دو نتھو

بینڈ ماسٹر کو دے دے۔

''ہاں جی! ضرور جی جناب! جیسے آپ حکم دیں،'' ماسٹر عبدالغفور نے کہا اور ایک ہار نتھو کو لا کر پیش کر دیا۔ مہر جیون، حنیف پہلوان اور سائیں بھولا بھی نتھو کے گرد جمع ہو گئے اور سب نے ایک ایک ہار پیشِ خدمت کر دیا۔ نتھو نے مسکرا کر سب جمع کر لیے۔ کچھ خود پہنے اور باقی اپنی کلارنٹ پر باندھ لیے اور پھر چمک کر کہا، ''ون... ٹو... تھری!'' بلبڑ کو دھکا دیا اور جلوس پھر سے چلنے لگا۔

چوک تک پہنچتے پہنچتے امن و امان قائم ہو چکا تھا۔ جو لوگ بھاگنا چاہتے تھے وہ بھاگ چکے تھے۔ جن کو ہار مل گئے تھے وہ اپنی ملکیتوں پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے اور ان کے چھن جانے کا ڈر اب نہیں رہا تھا۔ جنھیں ہار نہ ملے وہ اپنی قسمت پر قانع ہو گئے۔ چوک کی روشنی اردگرد کی آبادی کو اندھیرے میں ڈالے تھی اور اس اندھیرے کی اوٹ میں ہر چھت پر اشراف کی بہو بیٹیاں جلوس کا تماشا دیکھنے کھڑی تھیں۔ ان کی جسمانی موجودگی اگر کہیں قمقمے کا ایک شعلہ سا لپکتا تو محسوس ہوتی۔ ہجوم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھنے کی پوری کوشش کرتا۔ صرف کچھ پھلجڑیاں سی دکھائی دیتیں اور بس۔ کہیں کہیں دکانوں یا مکانوں کے درمیان روشنی کا ایک مخروطی سا آئینہ کسی مکان کی چھت تک چلا جاتا تو وہاں کچھ عکس سے دکھائی دیتے، یا کسی مکان کے پچھواڑے صحن میں روشنی ہوتی تو چند رنگین کالبد نظر آ جاتے۔ ہجوم کے لیے یہی کافی تھے۔ بابو کرم داد کے مکان کی چھت پر ایسا ہی سماں تھا مگر اس کی سوکھی سڑی لڑکیوں میں کسی کو اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی حنیف پہلوان کے مکان پر کھڑی پانچ ورزشی جسم کی لڑکیوں اور خود ان کی ماں میں تھی۔

نیم تاریکی میں کھڑی یہ لڑکیاں بھول گئی تھیں کہ ان کے ڈوپٹے کدھر گئے۔ اس شریر اندھیرے میں ان کے تمام اعضا کی گولائیاں اپنے سایوں کی وجہ سے ایسی واضح ہو گئی تھیں اور ہر گولائی ایسی بلند آہنگی سے اپنا اعلان کر رہی تھی کہ نوجوانوں کے منھ سے بے اختیار ''ہائے صدقے'' نکل نکل جاتا تھا اور پھر وہ اپنی زبان دانتوں میں لے کر کاٹتے تھے جیسے کسی لذت کو اذیت سے ختم کر رہے ہوں۔ حنیف پہلوان نے یہ فقرے سنے اور مڑ کر دیکھا کہ کون کون اپنی زبان کاٹ رہا ہے اور پھر ایسے قہر سے اپنی چھت کی جانب دیکھا کہ چھوں کی چھوں یک لخت یوں بیٹھ گئیں جیسے ان کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں۔ ان کے بیٹھنے سے نوجوانوں کو ایسی گدگدی ہوئی کہ یک زبان ہو کر بولے، ''ہائے مر گئے!'' حنیف پہلوان کا چہرہ تمتما اٹھا اور گو اصولاً بینڈ کو یہاں کچھ رکنا چاہیے تھا، مگر حنیف پہلوان کے اشارے پر بینڈ والے تیز تیز چلنے لگے تاکہ بیٹھک تک پہنچتے پہنچتے اور کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ہر ایک کی توجہ بیٹھک پر لگی تھی اور کسی کو احساس تک نہیں ہوا کہ گینڈا اپنی خون سے بھری قمیض لیے چوک تک ان کے پیچھے آیا ہے، اور ہجوم کی موجودگی سے ہمت پا کر مہر جیون کے احاطے کی طرف ایسے چلا گیا ہے جیسے کوئی اندھا، گونگا اور بہرا خواب میں چل رہا ہے۔

10

حنیف پہلوان کی بیٹھک میں دو کمرے ڈیوڑھی کے برابر برابر تھے اور ان کے پیچھے سر بسر ایک دالان تھا۔ باقی صحن چھوڑ دیا تھا جس کے گرد کوئی چھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ چھت پر صرف ایک دالان تھا اور باقی جگہ گرمیوں میں کھلے میں سونے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ اگر بارش آ جائے تو دالان کام آ سکتا تھا۔ ڈیوڑھی سے ایک دروازہ دالان کو جاتا تھا، دوسرا بڑے کمرے کو اور اس کے ایک طرف چھت پر جانے کے لیے زینہ تھا۔ مکان کے اندر آنے کے لیے صرف ڈیوڑھی سے راستہ تھا۔ وہاں دونوں کمروں کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں لیکن اس احتیاط سے اونچی اونچی بنائی گئی تھیں کہ گلی میں چلنے پھرنے والے اندر نہیں جھانک سکتے تھے۔ دونوں کمروں کا ایک ایک دروازہ دالان میں بھی کھلتا تھا۔

جلوس جب بیٹھک تک پہنچا تو مائی خیری نے اپنے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ بینڈ باجے والے چھت پر دالان میں کھانا کھانے چلے گئے۔ میاں محمد طفیل بی اے، مہر جیون، ماسٹر عبدالغفور اور حنیف پہلوان پچھلے کمرے میں چلے گئے جہاں نہایت پُر تکلف فرش تھا، سفید چاندنیاں بچھی تھیں اور نئے نکور گاؤ تکیے لگے تھے، دستر خوان پر چینی کے قاب اور طشتریاں تھیں اور پانی پینے کے لیے شیشے کے گلاس تھے۔ یہ سامان حنیف

پہلوان کے گھر سے آیا تھا۔ طشتریوں پر نیلے رنگ کا اژدہا بنا تھا جس کے منھ سے زوردار شعلے نکل رہے تھا۔ گلاسوں پر ابھی فیکٹری سے لگے ہوئے لیبل چپکے تھے جو مائی خیری نے شاید اس لیے نہیں اتارے تھے کہ ان کے نئے ہونے پر کوئی شک نہ کر سکے۔

آٹھوں پہلوان اور سائیں بھولا باہر کے کمرے میں بیٹھ گئے، مگر مائی خیری نے سائیں بھولے کو بیٹھنے نہ دیا—اگر بیٹھ گیا تو معزز مہمانوں کو کھانا کون کھلائے گا۔ اِدھر معزز مہمانوں کے لیے کھانا چنا گیا اور اُدھر مائی خیری نے جلوس کے باقی لوگوں کو ایک ایک مٹی کی طشتری کھیر کی تھما تھما کر چلتا کرنا شروع کر دیا۔ یہ مٹی کی طشتریاں خود امینہ یہاں چھوڑنے آئی تھی اور مائی خیری نے اس کی مدد سے ان میں کھیر جمائی تھی۔ ان پر چاندی کے ورق تمام کے تمام امینہ کے ہاتھ کے لگے ہوئے تھے۔ اگر ماسٹر عبدالغفور کو اس بات کا علم ہوتا تو چینی کی طشتری کے بجائے یہ مٹی کی طشتری لیتا اور شاید خالی طشتری ہمیشہ کے لیے اپنی کوٹھڑی میں سجا کر رکھتا، مگر امینہ کے ہاتھ کی سجی ہوئی مٹی کی طشتریوں میں سے ایک کے سوا سب کے سب عام لوگوں کے حصے میں آئیں۔ وہ مائی خیری نے ایک طرف رکھی تھی۔

ہر ایک نے کوشش کی کہ اسے کم از کم دو تو ضرور مل جائیں۔ بڑوں کے لیے یہ ذرا مشکل تھا مگر بچوں نے اپنی بہن، ماں، باپ، بھائی، ہر ایک کا نام لے لے کر دو دو چار چار لے لیں اور انھیں کتوں سے بچا بچا کر اپنے اپنے گھر چل دیے۔ صرف چند ایک حریص سے لڑکے اور درجنوں کتے بیٹھک کے باہر بیٹھے دعوت کے اختتام کا انتظار کرنے لگے۔ اور اندر حنیف پہلوان میاں محمد طفیل کو مسلمانوں کے مستقبل اور اس بیٹھک کی اہمیت سمجھاتا رہا اور میاں محمد طفیل بٹیروں کی ہڈیاں چباتے ہوئے حنیف پہلوان کی دور

رس نگاہوں کی داد دیتے رہے۔

مائی خیری نے نتھو اور اس کے بینڈ باجے والوں کے لیے چرس کا مناسب انتظام کر دیا تھا جسے دیکھ کر نتھو کو ہاروں والا قصہ فراموش کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد سب باجے والوں نے دو دو کش چرس کے لگائے اور دن بھر کی کارروائی کا جائزہ لیتے ہوئے قائل ہو گئے کہ حنیف پہلوان بہت بڑا استاد ہے اور مائی خیری بہت زبردست منتظم عورت ہے۔

کھانا کھانے کے بعد لوگ ایک ایک دو دو کر کے جانے لگے۔ صمدو، دینا اور معراج چلے گئے۔ نتھو کے بینڈ باجے والے بھی چلے گئے اور پہلوان، ورزشی لوگ اور جلوس والے بھی دن بھر کے کھیل تماشے کے بعد گھروں کو لوٹ گئے۔ صرف پچھلی کوٹھڑی کے خاص مہمان باقی رہ گئے جو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، پان چباتے، خلال کرتے، قوم کی ذہنی اور اخلاقی بہبودی کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ ماسٹر عبدالغفور، میاں محمد طفیل بی اے کے برابر بیٹھا، تعلیمی مسائل پر روشنی ڈال رہا تھا اور میاں محمد طفیل بی اے بتا رہا تھا کہ میونسپلٹی کتنے نئے سکول بنوانے والی ہے اور ہر ایک کی عمارت پر کیا خرچ آئے گا۔ بیشتر ٹھیکے تو ہندوؤں کو مل گئے تھے مگر ابھی کئی ایک ٹینڈر کھلنے باقی تھے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور مائی خیری آئی۔ باریک ململ کی سیاہ قمیض جس میں سے اس کے پائجامے کا نیفہ اور کلیوں والا ازار بند نظر آ رہا تھا، ہاتھ پاؤں میں مہندی کا رنگ چڑھا ہوا، دنداسے سے چمکدار دانت اور کنگھی پٹی طرحدار تھی۔ مائی خیری نے ہاتھ سے سارا ماتھا ڈھانپ کر سلام کیا۔

حنیف پہلوان نے جھک کر میاں محمد طفیل بی اے کے کان میں مائی خیری کے

متعلق کچھ تعارفی باتیں بتائیں اور میاں محمد طفیل نے خوشی کے مارے کہا:

"اچھا! واہ واہ! مائی خیری صاحبہ، تم نے نہایت اچھا انتظام کیا ہے۔ نہایت لذیذ کھانا پکایا ہے!"

مائی خیری نے اپنی تعریف سنی تو شکریہ ادا کیا اور پوچھا، "آپ نے فرنی بھی پسند کی ہے؟"

"ہاں بھئی، فرنی تو بہت ہی اچھی تھی۔ وہ بھی تم نے پکائی تھی؟"

"نہیں، فرنی تو میں نے نہیں پکائی۔" مائی خیری کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ "وہ تو جوان لڑکیوں کے پکانے کی چیز ہے!"

"جوان لڑکیوں کے پکانے کی چیز کیسے ہوئی؟" میاں محمد طفیل بی اے نے پوچھا۔

"میٹھی چیز جو ہوئی،" مائی خیری نے کہا اور سب ایک غلیظ سی ہنسی ہنسنے لگے۔

"یہ ہم نے نئی بات سنی ہے،" میاں محمد طفیل نے کہا۔

"دیکھنے سننے میں فرق ہوتا ہے،" مائی خیری نے کہا۔ "ابھی اصل تھالی تو فرنی کی جما کر اُس نے الگ رکھی ہے۔ لاؤں؟"

ساری محفل کا گویا رنگ ہی بدل گیا۔ حنیف پہلوان مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ مہر جیون ماہرِ فن بنا "ہوں ہوں" کر رہا تھا اور ماسٹر عبدالغفور کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔

"لاؤ پھر!" میاں محمد طفیل نے کہا۔ "اب تو ہم آپس میں ہی بیٹھے ہیں۔"

مائی خیری دروازے سے باہر نکل گئی اور سب لوگ اپنے کپڑے درست کر کے یوں تعظیم سے بیٹھ گئے جیسے کوئی پیر صاحب آنے والے ہوں۔ سب کی نگاہیں دروازے پر گڑی تھیں کہ دیکھیں کیا فرنی آنے والی ہے۔

دروازہ پھر کھلا اور کیوڑے کی مہک کے بعد امینہ اور اس کے پیچھے مائی خیری اسی طرح داخل ہوئیں جیسے مائی خیری کسی نئی نویلی دلہن کو دولھا کے پاس لے جارہی ہو۔

''آگے بڑھ کر سلام کرو میاں صاحب کو!'' مائی خیری نے کہا اور امینہ نظریں جھکائے، شرماتی، ہاتھ میں فرنی کی مٹی کی تھالی لیے آگے بڑھی۔ اس کے تمام لجانے، دوہرے ہونے کے باوجود اس کی دریدہ نظری واضح ہوگئی۔

امینہ کمرے میں کیا داخل ہوئی، ماسٹر عبدالغفور پر بجلی ہی گر گئی۔ اس کا رنگ فق اور ہاتھ پاؤں میں ایسا لرزہ شروع ہوگیا جیسے ملیریا کا بخار چڑھنے لگا ہو۔ حنیف پہلوان اپنی جگہ بیٹھا یوں ہلنے لگا جیسے کوئی پچھلا سبق یاد کر رہا ہو، اور مہر جیون ماہر کی آنکھ سے امینہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔ میاں محمد طفیل نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''واہ واہ! کیا فرنی ہے!'' اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ امینہ نے تھالی میاں محمد طفیل کو تھماتے ہوئے ماسٹر عبدالغفور کو دیکھا اور اس کی شرم و حیا یکسر ایسی غائب ہوئی کہ قہقہہ دبانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ زور سے منہ پر رکھے، اچھل کر پلٹی اور دو چھلانگوں میں کمرہ پار کر کے دروازے سے غائب ہوگئی۔ ساری محفل پر کھلم کھلا جنسی خواہشات قہقہوں کی شکل میں چھا گئیں۔ ماسٹر عبدالغفور کا دم گھٹنے لگا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور جوتا ٹٹولتے ٹٹولتے بیٹھک سے باہر ایک پٹخنی کھا کر لڑھکا اور اپنے احاطے میں چلا گیا۔

میاں محمد طفیل نے محسوس کیا کہ بیٹھک کے باہر کی دو سیڑھیاں خطرناک ہیں اس لیے اس نے یہاں میونسپلٹی کی ایک لالٹین لگوا دینے کا وعدہ کیا، جو آٹھ دن کے اندر اندر لگ گئی۔ اب اس لالٹین کی نشانی سے لوگ حنیف پہلوان کی بیٹھک پر آسانی سے پہنچ سکتے تھے، ڈیوڑھی میں غائب ہو سکتے تھے اور نہایت عمدہ فرنی چکھ سکتے تھے۔

11

اکھاڑا شروع ہونے کی گہما گہمی چوک میں ایک دن سے زیادہ نہ رہ سکی۔ اس کے اگلے ہی روز چوک اپنے معمول پر آ گیا۔ چند روز رفیع پان والے، نورے دودھ والے اور رانجھے حجام کے جسم دُکھتے رہے، انھیں اٹھنے بیٹھنے میں کچھ تکلیف محسوس ہوتی رہی، مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنے کاروبار میں لگ گیا اور چوک کی زندگی اپنی رٹ پر آ گئی۔ اب اکھاڑے بھلا کون جاتا تھا۔ رفیع، رانجھے اور دوسرے دکانداروں کو اپنی دکانیں سنبھالنا تھیں۔ معراج نتھ والا اچھا پہلوان ہونے کے باوجود تندور نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ حسّا دن بھر گندے نالے میں کھڑے رہنے کے بعد نتھو کی بیٹھک پر جا کر ڈھول پیٹنا ورزش سے بہتر سمجھتا تھا۔ باقی بینڈ باجے والے ویسے ہی ورزش کرنے نہیں بلکہ باجہ بجانے اکھاڑے میں گئے تھے: اب ان کی وہاں ضرورت نہیں تھی اس لیے اکھاڑے جانا بیکار تھا۔ رہے صمد وکشمیری، دینا اور حافظ، وہ پہلے ہی دن بھر کے کام کے بعد لنڈے بازار کے ایک اکھاڑے میں جانے والے تھے، اب قریب کھل گیا تو حنیف پہلوان کے اکھاڑے میں آنے لگے۔ پہلے بھی کبھی وہ چوک والوں سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ اب اکھاڑے جانے لگے تو چوک کو کوئی فرق محسوس تک نہ ہوا۔ لے دے کر ایک گینڈا تھا جس کا اکھاڑا شروع ہونے کے دن والا ہیجان ایک خاص سطح پر قائم رہ گیا اور پہلے دن کی

پنڈلیوں سے جو اس کا جسم دُکھنے لگا تو پہلوان بننے تک دُکھتا ہی رہا۔

اکھاڑا شروع ہونے کے اگلے روز گینڈا ابھی باقی چوک والوں کی طرح حسب معمول چوک میں آیا۔ یہاں بیٹھا، وہاں کھڑا ہوا، اِس کا کوئی کام کیا، اُس سے تکرار کی، برفی کی دو ایک مٹھیاں بھر کر کھائیں۔ کہیں شطرنج کی بازی لگی تو کھڑا دیکھتا رہا۔ رفیع نے جسم دُکھنے کا ذکر کیا تو اس نے بھی انگڑائی لی۔ نتھو کی بیٹھک پر گیا، نور پور کا چکر لگایا اور بظاہر اکھاڑے کے معاملات میں زیادہ بے تعلقی دکھاتا رہا مگر جہاں سہ پہر سر پر آئی، گینڈے میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہوئی۔ جسم دکھنے لگا، وہ ہر ایک سے بھڑنے لگا، چلتے چلتے بجلی کے کھمبوں سے ٹکرانے لگا، سڑک پر پڑے پتھروں کو ٹھوکریں مارنے لگا اور کسی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر، بجائے روز کے راستے پر چلنے کے اپنے آپ کو اکھاڑے کی جانب چلتا پانے لگا۔ کچھ فاصلہ چل کر وہ ٹھٹکا اور، جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو، پلٹا اور اپنے احاطے میں چلا گیا، اور پھر یہی راستہ چل کر جدھر سے پہلے روز گیا تھا، لال بادشاہ کے مزار پر آ گیا اور لال بادشاہ کی قبر کی اوٹ لے کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد یہ اس کا روز کا دستور ہو گیا، جس سے چوک کو کوئی فرق نہ پڑا۔

اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائی نہیں ہوتے تھے۔ صرف حنیف پہلوان اور مہر جیون سرخ پایوں والے بڑے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ سائیں بھولا حقہ بھر لاتا تھا اور اسے دو ایک آدمی گڑگڑاتے رہتے تھے۔ ہاں اکھاڑے میں پہلوان پہلے روز سے زیادہ اترے تھے۔ صمد و کشمیری، دینا اور حافظ نور پور کے تھے لیکن باقی زیادہ تر دوسری نواحی بستیوں سے آئے تھے۔ حنیف پہلوان کی امّت دور دور تک تھی۔ اسلام آباد، فیض باغ،

تاج پورہ، مصری شاہ وغیرہ سے اچھے اچھے نامی لفنگے اور بدمعاش جمع ہوے تھے۔ ایسے لوگ جنھیں حنیف پہلوان سے کام تھا — اگر پکڑے جاتے تو حنیف پہلوان ان کی ضمانتیں کروا سکتا تھا، جھوٹی گواہیاں مہیا کر سکتا تھا، انھیں چھپنے میں، پولیس سے بچنے میں مدد دے سکتا تھا اور ان خدمات کے عوض ان کی جسمانی قوت اپنی حفاظت اور اپنے جوئے خانے کے تحفظ کے لیے وقتاً فوقتاً تحکم اور دعوے سے استعمال کر سکتا تھا۔ یہ سب حنیف پہلوان کے 'بچے' کہلاتے تھے۔ حنیف پہلوان بڑی محبت سے انھیں ملتا تھا اور یہ بھی اس کی ایسی عزت کرتے تھے جیسی اپنے باپ کی بھی نہ کرتے ہوں۔ یہ سب کے سب اچھے پہلوان بھی تھے، لڑنے بھڑنے سے ڈرتے نہیں تھے؛ دھول دھپّا تو کیا، چاقو گھونپ دینے یا لوہے کا مکّا مار کر سر پھوڑ دینے سے نہیں جھجکتے تھے۔ انھیں شاید ارادتاً حنیف پہلوان نے پہلے روز نہیں بلایا تھا۔ پہلا روز 'اشراف' کے لیے مخصوص تھا اور مخلصانہ جلوس کے لیے، قوم کی خدمت اور مسلمانوں کو ورزش کی تلقین کے لیے، مگر اگلے روز سے حنیف پہلوان کا باقاعدہ 'کاروبار' شروع ہو گیا تھا۔

گینڈا قبر کی اوٹ میں بیٹھا بہت محفوظ رہتا تھا۔ وہ پہلوانوں کو اور ان کی کشتیوں کو ایسے دیکھتا تھا جیسے لوگ سنیما دیکھتے ہیں یا کتاب کہانی پڑھتے ہیں، اپنے آپ کو کسی شخص سے مناسبت یا مطابقت دے لیتے ہیں اور پھر اس کے غم میں غمگین اور اس کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ گینڈا ابھی بیٹھے بیٹھے اپنے خیالوں کی مدد سے پہلوانی کرتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی پہلوان دوسرے کا پنجہ لے کر انگلیاں مروڑتا تو درد گینڈے کے پوروں میں ہوتا۔ دھول کسی کی گردن پر پڑتی، گینڈا اپنی گردن پر ہاتھ سے مالش کرنے لگتا۔ جتنا زور

پندرہ بیس پہلوان اپنی اپنی جگہ لگاتے اُتنا یہ اکیلا سب کے ساتھ لگاتا اور شام تک اس قدر تھک جاتا کہ چلنا تک محال ہو جاتا۔ اکھاڑا ختم ہونے تک گینڈا یہیں بیٹھا گھنٹوں چار چراغوں کے درمیان خالی اکھاڑے کو تکتا رہتا۔

اکھاڑے کے چاروں کونوں پر چار چراغ ارد گرد کے خلا میں بھوتوں کی آنکھوں کی طرح کچھ ڈھونڈتے معلوم ہوتے اور شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں ان کی لرزتی لو اکھاڑے کی مٹی میں ایسا زیر و بم پیدا کرتی جیسے دھرتی سانس لے رہی ہو۔ گینڈا لال بادشاہ کی قبر کے اوپر سے جھانکتا۔ جو منظر پہلے دیکھ چکا ہوتا وہ کبھی کبھی اسے دوبارہ نظر آنے لگتا۔ فرق اتنا ہوتا کہ اکھاڑا کچھ جاگ سا اٹھتا۔ اس میں صرف دو پہلوان اترے ہوتے۔ چاروں طرف کی مٹی کانپ رہی ہوتی۔ ان پہلوانوں کی دہشت سے چراغ بھی لرز لرز اٹھتے۔ ایک پہلوان نہایت 'کھردرا' قسم کا ہوتا۔ میلا سا لنگوٹ، منحوس صورت، جسم پر بڑے بڑے بال اور ہزار مالشوں کے باوجود اس کا جسم چمک نہ سکتا۔ دوسرا پہلوان وجیہہ ہوتا۔ اس کا ماتھا چمکتا ہوا اور جسم اتنا صاف کہ دیے کی روشنی اس پر پھسل پھسل پڑتی۔ یہ سرخ رنگ کا ریشمی لنگوٹ پہنے، مونچھوں کو تاؤ دیتا اکھاڑے میں اترتا۔ ان کا دنگل پتلیوں کے تماشے کی طرح ہوتا۔ ایک دو پکڑیں ہوتیں جو گینڈے کو آتی تھیں۔ وجیہہ نوجوان دوسرے کو اٹھا اٹھا کر پھینکتا اور پھر آہستہ آہستہ پہاڑ کی طرح بلند ہوتا جاتا اور منحوس صورت شخص چیونٹی کی طرح سمٹتا جاتا، حتیٰ کہ وجیہہ نوجوان منحوس صورت کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل کر مٹی میں ملا دیتا۔ اس دنگل سے گینڈے کو اس قدر فرحت ہوتی کہ تمام تھکن یکسر غائب ہو جاتی اور وہ وجیہہ نوجوان کی طرح چلتا اپنے احاطے میں آ کر سو جاتا۔ اگلے روز

پھر گینڈا اسی طرح چوک میں آتا جیسے اس کا برسوں کا دستور تھا، اور دن بھر اسی طرح رہتا جیسے ہمیشہ سے رہتا آیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے آپ کو وجیہہ نوجوان محسوس کرتا۔ ہو تو ہو، ظاہرا یہ وہی گینڈا تھا جو اکھاڑا شروع ہونے سے پہلے ہر روز چوک میں نظر آتا تھا۔

گینڈے کی طرح مائی خیری میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی ہر روز اپنی بھٹی گرم کرتی تھی، نور پور کے بچوں کے لیے اناج بھونتی تھی، حنیف پہلوان کے گھر اسی طرح کام کرتی تھی جس طرح بابو کرم داد کے ہاں، اور اشراف کو اس پر اب بھی اتنا ہی اعتماد تھا جتنا بیٹھک شروع ہونے سے پہلے تھا۔

اکھاڑا اور بیٹھک شروع ہونے کا دن آیا اور گیا۔ نور پور کا چوک ایک لمحے کے لیے بیدار ہوا اور اپنی رٹ پر آ گیا۔ یہ کچھ نواحی بستیوں میں خوبی ہوتی ہے کہ یہاں ہر قسم کا آدمی ایسے سما جاتا ہے جیسے کسی اندھے کنویں میں گر گیا ہو۔ اس کے آنے سے نہ کوئی آواز پیدا ہوتی ہے نہ کنواں چھلکتا ہے۔ ہر ایک اس میں غارت ہو کر اس کا ضروری جز بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں کوئی سانحہ، کوئی حادثہ، کوئی ہیبت ناک سے ہیبت ناک واقعہ ہو جائے، کوئی ہلچل نہیں مچتی۔ بہت ہوا تو ایک لمحے کے لیے سب نے گردن موڑ کر دیکھا کہ کیا ہوا ہے، اور پھر اسے یوں بھول گئے جیسے ذہن کسی بات کو پرکھنے کو تو کیا، قبول تک کرنے کو تیار نہیں۔

12

برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ ابھی ایک آدھ بارش ہوئی تھی اور نور پور کی سڑلوں کا پانی مہر جیون کے کنویں کے قریب اکھاڑے پر جمع ہونے لگا تھا۔ گھنے بادلوں کے دَل سر پر سے گزرتے تو پہلوان سوچتے کہ تھوڑے دنوں کے بعد اکھاڑا بند کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی برسات کے موسم میں ورزش کی جائے تو جوڑوں میں پانی بیٹھ جاتا ہے اور گٹھیا کا خطرہ رہتا ہے۔

سائیں بھولے کی کوٹھڑی کے برابر اور لال شاہ کے مزار کے آس پاس جامن کے درختوں پر پھل ابھی پورے نہیں پکے تھے مگر نور پور کے تمام بچے دوپہر کو ابھی سے یہاں جمع ہونے لگے تھے۔ درختوں کی چھاؤں میں آنکھ مچولی ہوتی اور کچے کچے جامن کھانے کے لیے لڑکے درختوں پر بھی چڑھے رہتے۔ ان کے کھیل سے وہ شور مچتا اور مار پٹائی ہوتی کہ سائیں بھولا کے لیے دوپہر کو سونا مشکل ہو جاتا۔ اور جو کہیں حنیف پہلوان بھی دوپہر کاٹنے ان درختوں کی چھاؤں میں آ کر لیٹ جاتا تو سائیں بھولا کی دوپہر ان لڑکوں کو یہاں سے بھگانے میں کٹ جاتی۔ گینڈا ابھی دوپہر کو یہاں آتا اور بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا یا انھیں جامن توڑنے میں مدد دیتا۔

حنیف پہلوان اپنی سرخ پائے والی بڑی چارپائی پر لیٹا، پگڑی کے شملے سے منھ

ڈھانپے، خرّاٹے لے رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ذہن اپنے کاروبار کے انتظام کے لیے کن چکروں میں تھا کہ خواب میں بھی اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بڑبڑا کر جاگ اٹھتا اور مکھیاں اڑا کر اِدھر اُدھر دیکھتا جیسے اس شخص کو ڈھونڈ رہا ہو جو خواب میں تنگ کر رہا تھا۔ جوں ہی وہ چونکتا، سب لڑکے یکدم خاموش ہو کر اِدھر اُدھر درختوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے۔ وہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ حنیف پہلوان ان کے جگانے سے جاگ گیا ہے، مگر حنیف پہلوان پھر خراٹے لینے لگتا اور وہ اپنا کھیل شروع کر دیتے۔ ہوتے ہوتے ان کا کھیل کچھ ایسی صورت اختیار کر گیا کہ تمام بچے ایک طرف ہو گئے اور گینڈا اکیلا دوسری طرف رہ گیا۔ سب کے سب اس پر حملہ کرتے اور یہ کبھی ایک کو پکڑ کر پٹکتا اور کبھی دوسرے کو۔ وہ چلّاتے چلّاتے کبھی ہنسنے لگتے اور کبھی رونے لگتے، مگر جونہی اس کے پنجے سے نجات ملتی، پھر اس کے گرد ہو جاتے۔ گینڈا ان بچوں پر بھی اپنا حربہ استعمال کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی بچے سے بغلگیر ہو کر ذرا زور سے بھینچتا تو یقیناً بچہ مر جاتا۔ یہ نہیں کہ اس میں اتنی سمجھ تھی کہ وہ بچوں کو زور سے بھینچتا ہی نہیں تھا بلکہ وہ ابھی بچے کو اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگاتا ہی تھا کہ بچے کا نرم نرم جسم اس کے اپنے جسم میں گدگدی سی پیدا کر دیتا اور وہ اس کو یوں پھینک دیتا اور زور زور سے ہنسنے لگتا جیسے اس گدگدی کی وجہ سے اپنے بازوؤں میں کوئی چیز تھام ہی نہیں سکتا۔ تاہم محض گینڈے کے بازوؤں میں جانے ہی سے بچے کا دم گھٹنے لگتا اور وہ ہنستے ہنستے رو دیتے یا روتے روتے ہنس دیتے۔ اس شور شرابے میں ایسا ہنگامہ ہوا کہ حنیف پہلوان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بیٹھتے ہی اس نے وہ منظر دیکھا جس سے اس کے ہونٹوں پر ایسی تسکین کی مسکراہٹ آ گئی جس کی گویا اسے

ضرورت تھی۔ یہ ایسا لمحہ تھا جو ہر شخص پر کبھی کبھی آتا ہے؛ جب انسان بے سوچے سمجھے، محض اپنی حسیات کے سرپر، اپنی مشکلوں کا ایسا حل اپنی آنکھوں کے سامنے پاتا ہے جس کی اس کو توقع تک نہیں ہوتی اور آئندہ طریقِ کار کا فیصلہ کیا کترا اسے پلک جھپکتے ہی میسّر آ جاتا ہے۔

حنیف پہلوان نے دیکھا کہ گینڈا یوں کھڑا ہے جیسے مچھلی کے تیل کے ایک اشتہار پر ایک صاحب بہادر کھڑا رہتا ہے جس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک مچھلی دُم سے پکڑ کر رکھی ہوتی ہے۔ گینڈا بالکل اسی طرح جم کر کھڑا تھا۔ اس نے بازو دائیں بائیں پھیلا رکھے تھے اور دونوں سے ایک ایک لڑکا الٹا لٹک رہا تھا اور مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ گینڈا ان کے تلملانے پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا اور انھیں باری باری سے دیکھ کر ان کی ٹانگوں پر اپنی گرفت تھوڑی اور مضبوط کر رہا تھا کہ وہ زیادہ تلملائیں۔ دونوں لڑکے گینڈے کو لاکھوں گالیاں دے رہے تھے مگر وہ خوش تھا۔ اس منظر میں حنیف پہلوان کو اپنی تکلیفات کا حل علامات کی شکل میں ملا اور اس نے گینڈے کو آواز دی۔ گینڈے نے دونوں لڑکوں کی ٹانگوں سے اپنی گرفت ہٹالی اور وہ سر کے بل دھک سے گرے، مگر گرتے ہی اٹھے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

گینڈا مسکراتا ہوا حنیف پہلوان کے پاس آیا اور حنیف پہلوان نے اسے یوں دیکھا جیسے ماہر انجینئر کسی مشین کو دیکھتے ہیں۔ حنیف پہلوان کو کچھ تسلی محسوس ہوئی اور اس نے گینڈے سے کہا، ''طاقت دکھانی ہے تو اکھاڑے میں آ، بچوں سے لڑنے کا کیا فائدہ؟'' گینڈے کی باچھیں کھل گئیں اور وہ اکھاڑے میں آنے کی تیاری کرنے کے

لیے اپنے احاطے کی طرف چل پڑا۔

سہ پہر کو حنیف پہلوان گینڈے کے انتظار میں رہا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ گینڈا اس کا مطلب سمجھا ہے، مگر گینڈے کی تو امید بر آئی تھی اور وہ نہا دھو کر نئے سفید کپڑے پہن کر یوں چلا آ رہا تھا جیسے پہلوان ہو گیا ہو۔ اسے دور سے آتا دیکھ کر حنیف پہلوان نے دینے گاڑی بان سے کہا، "وہ چلا آ رہا ہے گینڈا، ذرا اسے ایک رگڑ دینا۔"

دینے نے گینڈے کو یوں حقارت سے دیکھا جیسے شکاری پالتو جانور کو دیکھتے ہیں، اور جتنی دیر میں گینڈے نے کپڑے اتار کر تیل کی مالش کی، دینا اکھاڑے کے کنارے بیٹھا اسے تکتا رہا۔ حنیف پہلوان بھی گینڈے سے چھپ چھپ کر اسے دیکھ رہا تھا۔

گینڈے کا جسم لنگوٹ میں اس قدر بے ہودہ معلوم نہیں ہوتا تھا جتنا شلوار قمیض پہنے ہوئے بے ڈھب نظر آتا تھا۔ اس کے گرے ہوئے شانے مضحکہ خیز ضرور تھے مگر باقی دھڑ اچھا خاصا متناسب تھا۔ اوپر ایک سر کچھ اس طرح ضرور لگا تھا جیسے گینڈے کی گردن ٹوٹی ہوئی ہو۔ تاہم جب وہ حنیف پہلوان سے اجازت لے کر اکھاڑے میں اترا اور پینترا جما کر کھڑا ہوا تو دینے سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ گینڈا بھی مسکرا دیا اور اس نے ہوا میں یوں ہاتھ مارے جیسے دِینے پر جادو کرنا چاہتا ہو۔ دینے کو معلوم تھا کہ اگر گینڈے کے سامنے نہ رہا جائے بلکہ ایک طرف سے اس پر لپکا جائے تو گینڈا حملے کا توڑ نہیں کیا کرتا۔ اس نے یونہی ایک طرف ہو کر گینڈے کی ٹانگ کھینچی تو گینڈا دھم سے زمین پر منہ کے بل آ رہا۔ حنیف پہلوان نے آنکھوں ہی سے شہ دی اور دینے نے گینڈے کو زمین پر رگڑنا شروع کر دیا۔ گینڈے نے ہزار کوشش کی کہ کسی صورت بچے، مگر نہیں، دینا

اس کے گھٹنوں پر زور پڑنے ہی نہیں دیتا تھا۔ یہ منھ کے بل پڑا یوں گھسیٹا جا رہا تھا جیسے کھیت میں سہاگہ پھیرا جا رہا ہو۔ دینے کا ایک گھٹنا گینڈے کی کمر پر تھا اور ایک کہنی اس کی گردن پر، دوسری کہنی سے ٹیک دے کر دینا دوسرے گھٹنے سے جھٹکے دیتا اور اس طرح گینڈے کو اکھاڑے کے چکر پر چکر دیتا۔ جوں ہی گینڈا اٹھنے کی کوشش کرتا، اس کی کمر پر دینا اپنے گھٹنے سے زور کا جھٹکا دیتا اور گینڈا دو گز آگے جا گرتا۔ دینا اس کے اوپر بیٹھے بیٹھے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

کوئی چار پانچ منٹ میں گینڈے کا منھ، آنکھیں اور ناک مٹی سے بھر گئے اور اسے بے تحاشا کھانسی آنے لگی۔ حنیف پہلوان نے اشارہ کیا تو دینے نے چھوڑ دیا۔ گینڈا مٹی میں لت پت سچ مچ کا بھوت معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے آج خاص طور پر سر منڈایا تھا اور اوپر منوں تیل ملا تھا۔ اس کا سر مٹی کا بڑا ڈھیلا معلوم ہوتا تھا۔ کچھ کھانسنے سے اور کچھ چھینکنے سے گینڈے کی آنکھیں بھی آنکھ ہی کے پانی سے صاف ہو گئیں اور جونہی اسے سانس پھر ٹھیک سے آنے لگی، وہ اکھاڑے میں واپس اتر آیا۔ دینا اکھاڑے میں بیٹھا گینڈے کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا، جسے وہ نہایت حقیر چیز سمجھ رہا تھا۔ گینڈے کو آتے دیکھ کر ابھی کھڑا ہوا ہی تھا کہ کسی صورت گینڈے کے دونوں بازو دینے کی کمر کے گرد پڑ گئے اور گینڈے نے ایک ہاتھ اپنے دوسرے بازو کی کلائی پکڑ کر دینے کو بھینچنا شروع کر دیا۔ دینا پہلوان تھا، داؤ پیچ سے خوب واقف تھا، اس نے سینے میں پوری سانس بھر کر روک لی اور گینڈے کی گردن قابو کر کے ٹانگیں زمین سے اٹھا کر گینڈے کی گردن سے اٹک گیا اور اپنی ٹانگوں کو زور زور سے جھٹکے دیے حتیٰ کہ دونوں دھڑ سے زمین پر آ

رہے، مگر گینڈا تھا کہ پیرِ تسمہ پا کی طرح دینے کی کمر سے لپٹا تھا اور زور زور سے اسے بھینچ رہا تھا۔ دینا زیادہ دیر اَور سانس نہیں روک سکتا تھا چنانچہ اس نے پوری طاقت سے لوٹ پوٹ ہونا شروع کر دیا۔ دونوں اکھاڑے کے ایک کنارے سے دوسرے پر پہنچ گئے مگر گینڈے نے اپنی گرفت ڈھیلی کرنی تھی نہ کی۔ دینے کی سانس رکنے لگی تو سینے میں بھری ہوئی سانس چیخ کی صورت میں نکل گئی۔ اس پر حنیف پہلوان اور دوسرے لوگ مدد کو دوڑے۔ دینے نے گینڈے کے گھونسے مارنا شروع کر دیے اور اس کی ناک منہ لہولہان کر دیا۔ گینڈے کے بازو دو آہنی سلاخوں کی طرح دینے کو یوں حلقہ کیے رہے جیسے کوئی لوہار ہی آ کر حلقہ توڑے تو ٹوٹے۔ پہلے تو سب لوگوں نے پکار پکار کر گینڈے کو کہا کہ جوڑ توڑ دو، مگر کہاں! گینڈا دانت پیستا، جھٹکا دے کر زور سے دینے کو بھینچتا۔ دینے کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور گردن یوں گر گئی جیسے حلال کیے ہوئے مرغے کی ہوتی ہے۔ قریب تھا کہ دینے کا دم نکل جائے جب حنیف پہلوان نے ایک طمانچہ مار کر کہا، ''چھوڑ دے گینڈے پہلوان!'' یہ الفاظ حنیف پہلوان کے منہ سے نکلنے تھے کہ گینڈے کے بازو موم کی طرح پگھل گئے اور بیہوش دینا آزاد ہو گیا۔ گینڈا 'پہلوان' مان لیا گیا تھا۔ اس مسرت نے ایک خوفناک ہنسی کی صورت میں گینڈے کے چہرے کو ہیبت ناک بنا دیا۔

کچھ لوگ دینے کو ہوش میں لانے لگے اور حنیف پہلوان نے گینڈے کی پیٹھ ٹھونکی اور کہا، ''جا پہلوان! کنویں پر جا کر ہاتھ منہ دھو۔''

جتنی دیر میں گینڈے نے ہاتھ منہ دھویا، دینا بھی ہوش میں آ گیا۔ ایک دو

پہلوانوں نے اسے مالش والش کی اور وہ حنیف پہلوان کے پاس آ کر گینڈے کو گالی دینے لگا۔ عین ممکن نظر آتا تھا کہ دو فریق بن جائیں اور زوردار بلوہ ہو جائے، مگر حنیف پہلوان دینے کو الگ لے گیا اور اسے سمجھایا کہ لڑنا جھگڑنا پہلوانوں کا شیوہ نہیں۔ پھر گینڈے کو دو دو ہزار گالی دی اور تنبیہ کردی کہ اگر آئندہ اس نے استاد کا حکم نہ مانا اور فوراً جوڑ نہ توڑ دیا تو مارے جوتوں کے سر گنجا کر دیا جائے گا اور پھر کسی اکھاڑے میں اترنے کی اجازت نہیں مل سکے گی۔ حالانکہ حنیف پہلوان نے گینڈے کو جوڑ توڑنے کا حکم دیا ہی تھا تو اس نے توڑ دیا تھا، گینڈا ہنس دیا۔ سارا ہجوم ہنس رہا تھا اور فیصلہ ہوا کہ صلح صفائی ہو جائے، چنانچہ دینا اور گینڈا مصافحہ کرنے کے بعد مختلف سمتوں میں چلے گئے اور حنیف پہلوان کی خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں کہ جو معنی وہ گینڈے کو پہنانا چاہتا تھا وہ اس نے پہن لیے۔

اس معرکے کی خبر سارے نور پور میں پھیل گئی اور اس دن سے سب لوگ گینڈے کو گینڈا پہلوان کہنے لگے۔

13

شاید یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ وہ گینڈے پہلوان سے ڈر نہیں گیا تھا، یا اس خیال سے کہ گینڈے کی کمزوریوں کو پوری طرح جان لے تو ایک دن اپنی بے عزتی کا اس سے پورا بدلہ لے، دینا ہر روز گینڈے کو ورزش کرانا منظور کر لیتا تھا۔ سب پہلوانوں پر کچھ ایسا ہول طاری ہو گیا تھا کہ وہ اکھاڑے میں گینڈے کے سامنے کھڑے ہونے تک کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ ہر روز حنیف پہلوان التجا بھری نظروں سے سب کو باری باری تکتا کہ کون گینڈے کے ساتھ ایک دو پکڑیں کرنے پر راضی ہوتا ہے، مگر ہر ایک نظریں چراتا۔ آخر دینا اپنے استاد کی مشکل کشائی کرتا اور خود ہی کہتا کہ آؤ گینڈے پہلوان، ہم بھی ایک دو پکڑیں کر لیں۔ گینڈا پہلے سے تیار کھڑا ہوتا، کود کر اکھاڑے میں آتا اور کھڑا ہو کر اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور دینے کا سارے اکھاڑے میں تعاقب کرتا پھرتا۔ دینا گینڈے کے مقابلے میں تیزی اور پھرتی کے بل پر جلدی جلدی جوڑ ملاتا اور توڑتا رہتا اور بڑی احتیاط کرتا کہ کسی صورت گینڈے کے بازو اس کی گردن میں حمائل نہ ہونے پائیں۔ اس طرح ان کی ورزش مرغوں کی لڑائی کی طرح چند منٹ کے بعد ختم ہو جاتی۔ گینڈا خوشی خوشی اکھاڑے سے باہر آتا، استاد سے شاباش لیتا اور پھر ڈنڈ پیلنے لگتا یا پہلوانوں کے نہانے کے لیے کنوئیں میں جُت کر پانی نکالنے لگتا۔ جتنا عرصہ گینڈا

اکھاڑے میں رہتا، حنیف پہلوان کے لیے سورج سوا نیزے پر آیا رہتا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نگاہیں گینڈے سے نہ ہٹتیں۔ وہ گینڈے اور دینے کی ذرا ذرا سی جنبشوں پر، ہر پینترے پر خوف کھاتا رہتا کہ اب گینڈے نے دینے کو دبوچا اور اب اس سے بغلگیر ہو کر اس کو بھینچ کر مار ڈالا۔ دینے کی آنکھیں شکاری کی طرح گینڈے پر جمی رہتیں کہ کہیں گینڈا اسے غافل پا کر اپنا عمل نہ شروع کر دے۔ ساتھ ہی ساتھ دینا گینڈے کے تمام داؤ ذہن نشین کرتا رہتا اور حفظِ ماتقدم کی تدبیریں سوچتا رہتا۔ ان تمام کارروائیوں کے باوجود گینڈے کے اکھاڑے میں اترنے سے باہر آنے تک ہر شخص کسی نہ کسی حادثے کے انتظار اور اس کے خطرے سے باخبر بیٹھا معلوم ہوتا اور جب تک دینا اور گینڈا اکھاڑے سے باہر نہ نکل آتے، کسی کو چین کی سانس نہ آتی۔

حنیف پہلوان پر تو گینڈے کے عمل کی ایسی دہشت بیٹھ گئی تھی کہ وہ روز دعائیں مانگتا کہ برسات لگ جائے اور اکھاڑا خوش اسلوبی سے ختم ہو جائے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جب تک اکھاڑا چلتا رہے گا، گینڈے کو اس سے ہٹا کر بیٹھک کے کام پر لگانے کا کوئی موقع نہیں آئے گا۔ اس کے لیے گینڈا بطور پہلوان اہم نہیں تھا۔ اس کے اکھاڑے میں آنے، ورزش کرنے اور کشتی کے داؤ پیچ سے واقفیت حاصل کرنے میں حنیف پہلوان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس طاقتور انسانی مشین کو مستقل طور پر بیٹھک کی حفاظت اور جوئے خانے کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے کے لیے زدوکوب کے ایک آلے میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ گینڈے کو اکھاڑے میں لانا اس راہ کی صرف ایک منزل تھا اور وہ اس منزل کی کوفت محض اس لیے برداشت کر رہا تھا کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آیا کہ بادل خوب گھر کر آئے، خوب گرجے اور بجلی نے چمک چمک کر اُس دن کی آمد کا اعلان کیا جس کا انتظار حنیف پہلوان بڑی بے صبری سے کر رہا تھا۔ حنیف پہلوان نے اس کے استقبال کا بڑے التزام سے بندوبست کیا۔ بہت سے آم منگوائے، برف کے بڑے بڑے ڈبے رفیع نے بھیجے، اور جب برسات لگی تو سب پہلوانوں نے لنگوٹ کس کر آموں پر ہاتھ صاف کیے، بارش میں نہائے۔ نورے دودھ والے کی دکان سے موٹی بالائی کی تہوں والا دودھ سیروں کے حساب سے آیا اور سب نے اس میں برف ملا کر پیٹ بھر کر پیا۔

اس کھانے پینے کے دوران میں کبھی کبھی کچھ لوگ کبڈی کا ایک آدھ مقابلہ بھی کر لیتے مگر جہاں حنیف پہلوان دیکھتا کہ گینڈا ابھی کبڈی میں شریک ہونے لگا ہے، وہ فوراً ایک آم کی مٹھاس کی ایسی تعریف کرتا یا دودھ پر سے بالائی اُتار کر ایسے دلفریب انداز سے گینڈے کو پیش کرتا کہ گینڈا کبڈی بھول کر پھر آم چوسنے میں یا دودھ پینے میں مصروف ہو جاتا اور حنیف پہلوان کی جان میں جان آتی کہ آئی بلا ٹل گئی۔

شام تک اتنا پانی برس چکا تھا کہ نور پور کی ٹھنڈی سڑک اور عزیز روڈ پر گھٹنوں تک آ گیا تھا اور اکھاڑے پر ایسا تالاب بن گیا تھا کہ ہر ایک اس میں بے خطر تیر سکتا تھا۔ جب سڑک پر بجلیاں روشن ہوئیں اور دکانداروں نے بتیاں جلائیں تو نور پور سمندر پر تیرتا ہوا جہاز معلوم ہونے لگا۔ آم ختم ہو گئے، دودھ پیا جا چکا، سب لوگ حنیف پہلوان سے رخصت مانگنے لگے۔ حنیف پہلوان نے انھیں دعائیں دیں اور برسات کی وجہ سے اکھاڑا بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ جونہی اکھاڑا پھر شروع ہو گا،

سائیں بھولا سب کو اطلاع پہنچا دے گا اور شروع سردیوں سے پھر بڑی دھوم دھام سے ورزش شروع ہو گی۔ بسنت پر لال بادشاہ کا عرس ہو گا۔ بہت بڑے دنگل کا انتظام کیا جائے گا اور سائیں بھولا اس کی پوری مشتہری کرے گا۔ عرس پر قوالیاں بھی ہوں گی اور اکھاڑے کی وہ دھوم مچے گی کہ غیر مسلم بستیوں میں رہنے والے محض اس کی شہرت سے مرعوب ہو کر الیکشنوں میں نور پور کے قریب تک نہیں پھٹک سکیں گے، اور کوئی کانگریسی یہاں میاں محمد طفیل بی اے کے مقابلے پر کھڑا ہونے کی جسارت نہیں کر سکے گا۔

اکھاڑا بند ہونے کے جشن میں سب لوگ سائیں بھولے کی کوٹھڑی کے سامنے والے چبوترے پر آ گئے تھے اور یہ بھول گئے تھے کہ حنیف پہلوان کا لال پایوں والا پلنگ اکھاڑے کے کنارے بارش میں پڑا ہے۔ آج اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی اس لیے اس کا کسی کو خیال نہ آیا اور آم اور دودھ ختم ہونے تک وہ پلنگ پانی میں تیرنے لگا۔ آہستہ آہستہ سیل اس میں اتنی رچ گئی کہ پلنگ تو ڈوب گیا، صرف اس کا ایک پایہ پانی کی سطح پر تیرتا نظر آنے لگا۔ جب سب پہلوان دو دو چار چار کی ٹولیاں بنائے اپنے اپنے گھروں کو چل دیے اور صرف شماں اور سائیں بھولا، گینڈا پہلوان اور حنیف پہلوان ہی سائیں بھولے کی کوٹھری کے سامنے کھڑے رہ گئے تو شمے کی نظر اچانک پلنگ کے پائے پر پڑی۔ اس نے پانی میں اتر کر اسے کھینچ لانے کے لیے قدم بڑھایا مگر حنیف پہلوان نے اسے گردن سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا اور قہر بھری ایک نگاہ ڈال کر اسے کوٹھڑی کے اندر دھکیل دیا، جیسے اسے کہہ رہا ہو کہ ''کمبخت، بنا بنایا کھیل بگاڑنے کی تجھے کیا سوجھی ہے۔ ہٹ، دور ہو یہاں سے!'' گینڈے اور سائیں بھولے نے حنیف پہلوان کی یہ حرکت

دیکھی اور ابھی کچھ کہہ نہ پائے تھے کہ حنیف پہلوان نے واپس آ کر شیطنت سے بھری مسکراہٹ کو دباتے ہوئے گینڈے سے کہا:

''گینڈے پہلوان! پلنگ تو برباد ہو گیا۔''

''ہوں!'' گینڈے نے جواب دیا اور اپنی جگہ پر جما کھڑا، پلنگ کے تیرتے پائے کو گھورنے لگا۔ گھر جاتے پہلوانوں کے پانی میں چلنے سے دور تک چھینٹیں اُڑنے کی آوازیں ایسے آ رہی تھیں جیسے اندھیری رات کی خاموشی میں سمندروں پر جہازی ڈاکو کشتیاں کھے رہے ہوں۔ سائیں بھولا حیرت سے حنیف پہلوان کو تکنے لگا۔ یہ کیا راز ہے کہ شماں پلنگ پانی سے نکالنے جا رہا تھا تو اس نے روک دیا اور اب خود ہی گینڈے کو بتلا رہا ہے کہ پلنگ برباد ہو گیا۔ شماں کوٹھڑی کے دروازے میں بت بنا کھڑا تھا۔ سائیں بھولے کا نطق کانٹا بن کر گلے میں چبھنے لگا۔ حنیف پہلوان کی دو چالوں نے فضا میں کچھ ایسا ہول بھر دیا کہ سب کے دل کسی خطرے کی آگاہی دینے لگے۔ وہ خود بظاہر مسکرا رہا تھا مگر ہول اس پر بھی طاری تھا۔ اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹھوس جن جسے گینڈا پہلوان کہتے ہیں، اس خاموشی کو کیسے توڑے گا جو ہر لمحے اَور بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ تینوں کی نگاہ گینڈے پہلوان کو جیسے چھیدنا چاہتی تھیں کہ دیکھیں اس کے دل میں کیا ہے۔ تینوں اپنے سینوں میں دلوں کی دھڑکنیں ایسے سن رہے تھے جیسے کسی ویرانے میں بوڑھے درخت کے تنے پر کئی لکڑہارے متواتر کلھاڑیاں چلا رہے ہوں، مگر گینڈا اس تمام ہیجان سے بے خبر، تیرتے پلنگ کے پائے کو گھورتا رہا۔ پھر جیسے یہ فضا اس پر بھی بھاری ہو گئی۔ اس نے مڑ کر شمے، سائیں بھولے اور حنیف پہلوان کو باری باری سے گھورا۔ ایک

کی وحشت، دوسرے کی حیرت اور تیسرے کی سوالیہ مسکراہٹ گینڈے نے دیکھی۔ معلوم نہیں ان میں سے اس پر کسی کا اثر ہوا یا کہ نہیں۔ اس نے پھر پلٹ کر پلنگ کے پائے کو گھورا اور نگاہیں اس پر بدستور جمائے نہایت احتیاط سے پانی میں چلنے لگا۔

گینڈے کی پہلی جنبش ہی سے شمے، سائیں بھولے اور حنیف پہلوان کے سینوں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ تینوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھنے لگے جیسے بھولے ہوئے دوست ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ گینڈے نے پلنگ کے قریب پہنچ کر اس کا پایہ پکڑ کر کھینچا۔ پلنگ بہت بھاری ہو گیا تھا، مگر گینڈے نے ایسا جھٹکا دیا کہ وہ سطح پر تیرنے لگا۔ اس نے پانی میں غوطہ لگایا اور پلنگ کے نیچے سر دے کر اسے سطح کے اوپر اٹھالیا، اس کے دو پائے تھامے اور واپس سائیں بھولا کی کوٹھڑی کی طرف آنے لگا۔

ابھی گینڈا چبوترے کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ حنیف پہلوان نے سائیں بھولے اور شمے کی طرف ایسے دیکھا جیسے پرانے دوست ایک دوسرے کو پہچان چکے ہوں اور پھر اپنی چادر کا لنگوٹ کس کر چوک کی طرف منھ کر کے قدم پانی میں رکھ دیا۔ چبوترے کے قریب آ کر گینڈے نے جب حنیف پہلوان کو پانی میں چلتے ہوئے دیکھا تو غیر ارادی طور پر چبوترے پر آنے کی بجائے حنیف پہلوان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

حنیف پہلوان نے مڑ کر سائیں بھولے کو ایسے دیکھا جیسے پرانے دوست مکمل طور پر ایک دوسرے کو پہچان چکے ہوں۔

آگے آگے حنیف پہلوان اور پیچھے پیچھے گینڈا پہلوان پانی میں چلتے چلتے، چوک سے گزر کر، ٹھنڈی سڑک کے کنارے بجلی کے قمقموں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتے، حنیف

پہلوان کی بیٹھک تک پہنچ گئے۔ حنیف پہلوان نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور گینڈا چار پائی ڈیوڑھی میں لے آیا۔ یہاں حنیف پہلوان نے جلدی سے ایک لالٹین جلائی اور یہ کہہ کر کہ پلنگ کہاں بچھائیں، گینڈے کو بیٹھک کی سیر کرانے لگا۔ پلنگ ابھی اس قدر بھیگ رہا تھا کہ اسے کسی کمرے میں ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بہر حال، حنیف پہلوان یوں چل رہا تھا جیسے وہ گینڈے سے مشورہ کر رہا ہو کہ پلنگ کہاں رکھا جائے۔ شاید وہ یہ چاہتا تھا کہ ابتدا ہی سے گینڈے میں بیٹھک کے متعلق ایک ذمے داری سی پیدا ہو جائے۔

پہلے کمرے میں صرف ایک دری بچھی تھی اور ایک کونے میں ایک چار پائی تھی۔ یہ کمرہ کافی گندا ہو رہا تھا۔ چھت سے جالے لٹک رہے تھے اور ایک کونے میں تین چار لالٹینیں رکھی تھیں جن کی چمنیاں کبھی صاف نہیں کی گئی تھیں۔ اُدھر ایک پیپا مٹی کے تیل کا تھا جس میں تیل نکالنے کا پمپ باہر لٹک رہا تھا اور چاروں طرف دری تیل سے چکٹ ہو رہی تھی۔ حنیف پہلوان نے کھڑکیاں کھولیں، دالان میں کھلنے والا دروازہ بھی کھول دیا۔ ٹھنڈی ہوا کمرے میں آنے لگی اور ساتھ ہی دروازے کے برابر راکھ اور جلے ہوئے کوئلوں کے ایک ڈھیر اور اس کے قریب پڑے ہوئے چرس بھری سگریٹوں کے ڈبوں سے بدبو اٹھی۔ اس بدبو سے گینڈا واقف تھا۔ نتھّی کی بیٹھک پر اس کے بادل ہمیشہ چھائے رہتے تھے۔

''یہاں رکھ دیں؟'' حنیف پہلوان نے پوچھا اور پھر برابر کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ گینڈا ابھی تک ڈیوڑھی سے کمرے میں آنے والے دروازے میں کھڑا تھا۔ یہ

سوال سن کر چونکا اور بغیر جواب دیے حنیف پہلوان کے پیچھے دوسرے کمرے کے دروازے پر آرکا۔

دوسرا کمرہ نہایت اچھا تھا۔ یہاں نیچے پھوس کی صفیں تھیں اور اوپر اچھی خاصی دری پر چاندنی کا فرش۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گاؤ تکیے لگے تھے اور پیتل کی طشتریوں میں پیچوان رکھے تھے جن کے ساتھ چاندی کی کلیاں لٹک رہی تھیں۔ ایک گاؤ تکیے کے پاس کئی پیکٹ تاش کے تھے۔ اُدھر شطرنج اور چوسر کا سامان تھا اور اس کے برابر ایک کھلا ڈبہ رکھا تھا۔ حنیف پہلوان نے کھڑکی کھولنے کے لیے چلتے ہوئے جان بوجھ کر اس ڈبے کو ٹھوکر ماری۔ ڈبہ الٹا اور اس میں سے بیسیوں دونیاں، چونّیاں اور روپے چھنچھناتے ہوئے فرش پر بکھر گئے۔ گینڈا لپکا، اس نے لالٹین تھامی اور سکّے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کرنے اور ڈبے میں ڈالنے لگا۔ حنیف پہلوان نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ اسے پورا احساس تھا کہ گینڈا کیا کر رہا ہے۔ گینڈا وہی کچھ کر رہا تھا جو حنیف پہلوان چاہتا تھا، اور اسے اپنی کامیابی پر مسرت ہو رہی تھی۔ ہر بات اس کے منصوبے کے مطابق کی جا رہی تھی۔ حنیف پہلوان مسکرا رہا تھا اور اپنے جادو کا جال اَور وسیع کرتا جا رہا تھا۔

حنیف پہلوان نے کھڑکیاں کھولنے کے بعد گینڈے سے بچتے ہوئے جا کر کمرے کا وہ دروازہ بھی کھولا جو دالان میں کھلتا تھا اور مڑ کر کہا، ''اور لالٹینیں جلانی چاہییں۔'' اور پھر خود دالان میں چلا گیا۔ گینڈے نے ایک لالٹین کی چمنی صاف کر کے اس میں تیل بھرا اور جلا کر اچھے کمرے میں رکھ دی۔ دوسری لالٹین کی چمنی صاف کی، اسے جلا کر باہر صحن میں لے گیا، جہاں حنیف پہلوان ٹہل رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے

مسمریزم کے کھیل میں حنیف پہلوان عامل اور گینڈا معمول ہو گیا تھا۔ اِدھر جو حنیف پہلوان کے دل میں آتا، گینڈا خود بخود بغیر کچھ بتائے سمجھائے، اور شاید خود بھی سمجھے بغیر کرنے لگا۔ اس نے تمام لالٹینیں صاف کیں، ان میں تیل بھرا، جلائیں اور دو دو دونوں کمروں میں، ایک دالان میں اور ایک ڈیوڑھی میں رکھ دی۔ پلنگ باہر سے اٹھا کر اندر دالان میں بچھا دی اور جھاڑو لے کر سارے گھر کی صفائی کر دی۔ کوڑا کرکٹ جمع کر کے گلی میں پھینک دیا۔ تکیوں پر جو گرد جمی تھی وہ جھاڑ کر صاف کر دی۔

حنیف پہلوان کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور جب اسے تسلی محسوس ہوئی کہ ہر چیز ٹھیک، ہر کام درست ہو گیا ہے تو اس نے الماری سے ایک تھیلا نکالا۔ ڈبے کی تمام ریزگاری اس میں الٹ لی اور پلٹ کر گینڈے سے کہا:

''کل جمعہ ہے۔ کل کوئی نہیں آئے گا۔ اوپر کی صفائی کل سہی!'' اور بیٹھک کی چابی گینڈے کو دیتے ہوئے ریزگاری والا تھیلا کاندھے پر ڈالا اور بیٹھک سے چلا گیا۔

گینڈے نے جیسے تمام کاروبار سمجھ لیا ہو، لالٹینیں ایک ایک کر کے گل کیں اور پلٹ کر دیکھے بغیر باہر آیا۔ بیٹھک کو تالا لگایا، اسے ایک دو مرتبہ پٹک کر دیکھا کہ کھل تو نہیں جائے گا اور چابی جیب میں ڈال کر چوک کی طرف ایسے چلا جیسے یہ اس کا روز کا دستور ہو۔

14

بھادوں کا مہینہ بہت گندا ہوتا ہے۔ ساون کی برسات سے زمین اس قدر نم ہو جاتی ہے کہ ایک ذرا سا چھینٹا پڑ جائے تو ہر طرف پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہر دو پہر بارش برس جائے تو سیلاب آ جاتا ہے۔ پھر دھوپ نکلتی ہے تو ایسی چمکدار کہ آنکھیں چُندھیاتی ہیں اور اس کی شعاعیں سوئیوں کی طرح جسم کو چھیدتی ہیں۔ بارش نہ بھی ہو تو دن بھر کی دھوپ سے سہ پہر تک زمین کی نمی اور فضا کا غبار بھاپ بن کر سانس لینا دشوار کر دیتے ہیں۔ پسینے سے بھیگے کُرتے گرمی دانوں پر ایسے چبھتے ہیں جیسے کسی نے سرخ مرچ پیس کر اس کا لیپ کر دیا ہو۔ ہزار پنکھا جھلو، ہوا نہیں لگتی۔ اس پر حبس سے اَدھ موئی مکھیاں کسی لیس دار مادّے سے لدی آتی ہیں اور ہاتھوں اور چہروں پر ایسے گِر گِر کر چپکتی ہیں جیسے اندھی چمگادڑیں آ لپٹی ہوں۔ ہزار ہلاؤ، اڑنے کا نام نہیں لیتیں۔ اک ذرا اٹھتی ہیں اور پھر عین اسی جگہ آ چپکتی ہیں جہاں سے اُٹھی تھیں۔ ان سے اس قدر الجھن ہوتی ہے کہ بھلا چنگا ہنس مکھ آدمی بھی مکھی کی ذات کو صلواتیں سنانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور طبیعت میں وہ چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے کہ الاماں۔ راتوں کو مچھر سونے نہیں دیتے اور دن کو گرمی، حبس اور حشرات الارض چین نہیں لینے دیتے۔

ایسے موسم میں اگر نتھو کا مزاج غیر معمولی طور پر خراب رہتا تھا تو وہ دنیا سے بھاگتا

تھا۔ ایک مہین سا لنگوٹ کس کر وہ مہر جیون کے کنویں پر چلا جاتا اور کنویں کی منڈیر پر، جو دن بھر جامن کے درختوں کے سائے میں رہتی تھی، بیٹھا پنکھیا جھلا کرتا۔ تھک جاتا تو اٹھ کر اِدھر اُدھر پھرتا اور دو دو چار چار منٹ کے وقفے سے زور زور سے پھونکیں مارتا جیسے باہر سے کہیں زیادہ حبس اس کے اندر ہو اور اسے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بھنگ سے کچھ ٹھنڈک تو آ جاتی تھی، پھر بھی اس کی کوشش یہی ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے ہوش و حواس چوبیس گھنٹے معطل ہی رکھے، اور اس سلسلے میں کچھ گرم چیزیں بھی کھانا پڑتی تھیں جو تنگ کرتی تھیں۔ ان سب حفاظتی تدابیر کے باوجود اسے چوک میں بھی آنا ہی پڑتا تھا — کچھ عادتاً اور کچھ ارادتاً — تا کہ دنیا اسے بھول نہ جائے اور اس کے شاگرد کہیں اور نہ چلے جائیں۔ عام طور پر اس کے شاگرد اس کے پاس کنویں پر ہی پہنچ جاتے تھے اور جب کبھی ہوا کچھ چین دیتی، وہ اپنی کلارنٹ پر ساونی، سارنگ اور ملہاروں کی دھنیں انھیں سناتا۔ کبھی سائیں بھولا گھڑا بجانے لگتا تو نتھو اپنی استادی کے شعبدے بھی دکھاتا۔ ماسٹر جہانگیر کو دو دو کروڑ گالی دیتا کہ آئے اور بجائے ایسا کلاونتی باجہ۔ ایک تان تنک کی ہو جاتی تو اسے دہراتا اور رانجھا اسے نظرِ بد سے بچانے کے لیے صدقے واری ہوتا رہتا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا کہ نتھو جہانگیر کو بالکل بھول کر کوئی ہلکی پھلکی پہاڑی دھن، کوئی سیدھی سادی ملہار بجاتے بجاتے اپنی صحیح آنکھ بھی بند کر لیتا اور اپنے نغمے کے نشے میں رونے لگتا۔ اس کے آنسو اس کی مونچھیں تر کر دیتے۔ یہ دیکھ کر حسنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ بلہڑا اپنا یہ بڑا منھ کھولے، کلارنٹ کو تکتے تکتے، دونوں آنکھوں کو الگ الگ نقطوں پر مرکوز کر لیتا اور پھر اسے کوئی خبر نہ رہتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ اگر رفیع یا مولا یا حاکم گنڈیری والا بھی ہوتے تو

"اللہ ہے... یا اللہ!" کرنے لگتے اور ان کے نتھنے عقیدت سے پھڑکنے لگتے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اکثر پروگرام بن جاتا کہ شام کو کباب بنائے جائیں، اور سب دو دو چار چار آنے جمع کر کے رفیع کی دکان کے تھڑے پر انگیٹھی جلا کر اس کے گرد آ بیٹھتے، کباب گرم گرم کھاتے اور عالمی مسائل پر اظہارِ خیال کرتے رہتے، یعنی یہ کہ اب حنیف پہلوان کی بیٹھک کا کاروبار کس مرحلے پر پہنچ گیا ہے، کون کون آنے جانے لگا ہے اور اس کی بدولت حنیف پہلوان کون سا ٹھیکہ لینے والا ہے۔ سائیں بھولا حنیف پہلوان اور میاں محمد طفیل بی اے سے اگر خوش ہوتا، اگر انھوں نے لال بادشاہ سے عقیدت مندی کے ماتحت اسے اور اس کے بالکے کو راشن پانی کے لیے اچھی رقم دے دی ہوتی، تو انھیں دعائیں دیتا۔ کہتا کہ یہاں اپنا کیا، ہر ایک کی گور گردن پر، مگر آدمی ہیرا ہونا چاہیے۔ اگر کہیں ان سے کوئی شکایت ہوتی تو کہتا کہ یہ سب حرام کی کمائی کھاتے ہیں اور دنیا کو حرام کاری سکھاتے ہیں۔ سب کے سب دونوں صورتوں میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ کوئی خبر لاتا کہ مائی خیری کب، کہاں، کن حالات میں، کس کے ہمراہ دیکھی گئی ہے، اور پھر ان حادثات کو جوڑ کر ان کا مطلب نکالتے۔ گینڈا بھی ان میں شریک ہوتا اور عام طور پر اتنا ہی شریک ہوتا جتنا کسی بات میں شریک ہونے کا اس کو مقدور تھا۔ ہاں، اگر کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دیتا یا بہت ہی مبالغہ کرتا تو وہ سب سے متوازن نقطۂ نظر پیش کر دیتا، گو عام طور پر اس بیٹھک کے متعلق، جس کا وہ اب اتنا ہی حصے دار تھا جتنا حنیف پہلوان، وہ اکثر باتیں چوک والوں سے سنتا؛ خود اسے بہت کم علم ہوتا کہ جو کچھ وہاں ہو رہا ہے اس کا مطلب معنی کیا ہے۔ اس کا علم اخباری رپورٹر کی طرح واقعات سے آگے نہیں جاتا تھا، اور اخباری رپورٹر کی طرح

اگر وہ واقعات سے آگے جانے کی کوشش بھی کرتا تو بے معنی بات ہی کرتا۔ خوش قسمتی سے یہ عادت اسے تھی نہیں۔ اُدھر مائی خیری کی بھٹّی، ماسٹر عبدالغفور کے پھیرے، بابو کرم داد، میاں طالع منداور دوسرے اکابرینِ چوک کے طور طریقے، رانجھے حجام کی دکان پر مختلف حضرات کا آنا جانا، یہ سب کچھ زیرِ بحث آتا اور بحث سے نکل جاتا، اور یہ ایسے ہوتا رہتا جیسے حنیف پہلوان کی بیٹھک کا کاروبار۔ پہلوانی کے دعوے، نئے نئے رشتے اور گٹھ جوڑ ہوے مگر ہوا کریں۔ نئی بستیوں میں یہ عجیب خوبی ہوتی ہے کہ ایک معمول، جو بہرحال اوپرا ہوتا ہے، ہر ہیجان اور ہر تبدیلی کو اپنے اندر ایسا جذب کر لیتا ہے کہ اس کی اجنبیت ختم ہو جاتی ہے۔ ان تمام اجنبیتوں کا اجتماع ہی معمول ہوتا ہے اور یہ ایسا بے معنی کہ کوئی نئی بات نئی اور پرانی بات پرانی نہیں ہوتی۔ شاید ان بستیوں کے لوگ اپنے آپ کو حالات کے اس قدر تابع کر چکے ہوتے ہیں اور ٹھہراؤ کے اس قدر طالب ہوتے ہیں کہ ایک فرضی ٹھہراؤ کا نظریہ بنا کر اسے ایسے ماننے لگتے ہیں جیسے وہ موجود ہو۔ اگر نھّو قسم کا کوئی ایسا آدمی بھی موجود ہو جو اجنبیتوں کو پہچانتا رہتا ہو تو وہ بھی انھیں پہچاننے کے بعد معمول میں کھو دیتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے اس کے متعلق اگر کوئی شخص کسی کارروائی کا مرتکب ہو جائے تو پھر وہ چوک والوں میں شریک نہیں بلکہ 'کوئی' ہو جاتا ہے، جیسے نھّو نے حنیف پہلوان کے نئے مکان کی اہمیت پہچان لی تھی اور اس کا اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ یہاں جوئے کا کاروبار کرے گا۔ یہاں اَور بھی بہت کچھ ہونے لگا مگر نھّو نے کوئی احتجاج نہیں کیا، صرف رائے زنی کرتا رہا، جو سب چوک والوں کا حق تھا۔ اسی طرح اس نے بھادوں کے عین آخر میں ایک اَور اجنبیت کو پہچانا۔ اس نے امینہ کو بازار سے گزرتے دیکھ کر ایک فیصلہ سنایا

جس پر سب چونکے مگر فوراً ہی اسے معمول میں مدغم کر دیا۔ اس نے جو دیکھا وہ محض اتنی سی بات تھی اور وہ سب نے دیکھی تھی۔

ایک روز برف خانے کا ایک ملازم رفیع پان والے کی دکان پر آیا اور اس سے مطالبہ کرنے لگا کہ وہ اگلے مہینے بھی اتنی ہی برف ہر روز خریدے جتنی پہلے خریدتا رہا ہے، ورنہ اس مہینے اسے برف نہیں ملے گی۔ رفیع کا خیال تھا کہ یہ بالکل بے انصافی کی بات ہے۔ جب گاہک برف کا پانی پینا بند کر دے گا تو رفیع اتنی ساری برف کو کیا کرے گا؟ بقول اس کے، برف سے سر کی مالش کرے گا؟ کارخانے والا کہتا تھا کہ یہ بات ہے تو رفیع کو اس مہینے بھی برف نہیں ملے گی۔

دیکھتے دیکھتے سارا چوک اس جھگڑے میں شریک ہو گیا اور ہر ایک اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور رفیع کی حمایت میں صرف کرنے لگا۔ سائیں بھولا اور شماں حق کی آواز بننے کو پھر رہے تھے جو دب نہیں سکتی۔ حسا برف توڑنے کی سلاخ ہاتھ میں لیے برف خانے والے کے سر پر گھما رہا تھا۔ حاکم اور مولا کسی کی سنتے نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام کارخانے دار چور ہوتے ہیں۔ برف سرے سے بکنی ہی نہیں چاہیے کیونکہ ہے تو یہ آخر کو پانی، اور پانی جتنا چاہو کنویں سے نکال لو، کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ گینڈا کچھ اس انداز سے کھڑا تک رہا تھا کہ اِدھر کارخانے والا کچھ اَور کہے اور یہ اسے پکڑ کر اس کی آنکھیں باہر نکال دے۔ صرف نتھو تھا کہ تھڑے پر اکڑوں بیٹھا، حقے کی نَے مٹھی میں لیے اور مٹھی کو اپنی مونچھوں کے سائے میں تھامے، سڑک پر تک رہا تھا اور ساتھ ساتھ کبھی ایک جملہ برف خانے والے کے حق میں اور کبھی اس کے خلاف کہہ رہا تھا۔ دل سے تو وہ

رفیع کی حمایت میں تھا مگر اس کا ذہن سڑک پر لگا تھا اور اس کی صحیح آنکھ امینہ کو دور سے آتے دیکھ رہی تھی، گو اس کی کانی آنکھ اس سے بھی دور دیکھ رہی تھی۔ شام کے جھٹپٹے میں شاید اسے امینہ کو پہچانتے دقت ہوئی تھی۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی مدھم چال سے چلی آ رہی ہے۔ اس کی چال امینہ کی دیکھی بھالی جانی پہچانی چال نہیں تھی۔ اس کی گردن سر کا بوجھ محسوس کر رہی تھی۔ اور ہر قدم پر کچھ ڈگمگاتی تھی۔ اس کے پاؤں گھسٹ کر تیزی سے نہیں اٹھتے تھے بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پہلے جسم کا سارا بوجھ ایک پاؤں پر رہتا ہے اور اس عرصے میں لڑکی کا کولھا مڑتا ہے اور دوسرا پاؤں زمین پر آتا ہے، پھر سارا بوجھ دوسرے پاؤں پر پڑتا ہے اور پہلا پاؤں کولھے کے زور سے اٹھتا ہے۔ اس پر اس جاپانی پہلوان کا گمان ہوتا تھا جو چابی سے چلتا ہے اور انارکلی میں کھلونوں کی ایک دکان کے سامنے ہر وقت دائیں بائیں ڈولتا اپنا پاؤں ٹپ ٹپ ٹیکتا اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اس چال کا مطلب وہ خوب سمجھتا تھا — شاید ہر ایک سمجھتا تھا مگر سب سے پہلے نھّو نے پہچانا کہ یہ امینہ ہے، اور جونہی اس نے پہچانا، اس کے منھ سے بے ساختہ نکلا، ”مر گئی... جیتے جی مر گئی۔ حنیف پہلوان کے ہاتھوں مر گئی اور ایسی مری ہے جو مرنے کی شرط ہے۔“

نھّو کی یہ چیخ امینہ نے بھی سنی اور باقی چوک والوں نے بھی سنی۔ وہ برف خانے والے سے ہٹ کر نھّو کی طرف آئے اور اس کی آنکھ کی سیدھ میں امینہ کو دیکھا۔ سب کی نگاہیں جس وقت امینہ پر پڑیں — گینڈے کی نگاہیں اور حسّے کی اور رفیع کی — اس وقت امینہ ایک لمحے کے لیے رکی تھی، جیسے اسے کسی نے سوتے سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو، اور پھر یہ نہیں ہوا کہ اس کی گردن اَور تن جاتی اور اس کے چہرے پر کھلی مسکراہٹ آتی اور وہ

اَور زیادہ گھسٹ گھسٹ کر قدم اٹھاتی، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ بے ساختہ اوپر اٹھے اور ڈوپٹے کو نوچ کر اس کے سر سے نیچے لائے اور اس کے پیٹ کو ایسے ڈھانپ دیا جیسے ننگا ہو رہا تھا، اور پھر اپینہ پھر سے چلنے لگی، ان لوگوں سے دور ہٹ کر اور عین اسی پہلوان کی طرح جو انارکلی بازار میں کھلونوں کی دکان کے سامنے دائیں بائیں ڈولتا ہے اور باری باری سے پاؤں اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹکتا ہے۔

جب تک وہ جھٹپٹے میں غائب نہیں ہوئی، نتھو زیرِلب کہتا رہا، ''مر گئی... بے موت مر گئی۔ حنیف پہلوان کے ہاتھوں مر گئی...''

کسی نے نتھو سے کچھ نہیں کہا۔ وہ حقے کی نال مٹھی میں لیے اور مٹھی اپنی مونچھوں کے سائے میں رکھے بولتا رہا۔ گھڑی بھر کے لیے ایک سناٹا چھایا اور پھر برف خانے والے نے اپنا مطالبہ پیش کر دیا، جس پر باقی لوگ رفیع کی حمایت میں اپنے پھیپھڑوں کا سارا زور پھر صرف کرنے لگے۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ نتھو کب اٹھ کر اپنی بیٹھک پر چلا گیا ہے۔

15

نتھو کی چیخ کے چند ہی روز بعد ایک دن حنیف پہلوان نے صبح صبح بیٹھک پر آتے ہی پانچ روپے گینڈے کو دیے اور اس سے کہا، ''پہلوان! ذرا میرے گھر جا اور جو سودا وہ کہیں، لا دے۔''

گینڈے نے پانچ روپے تو تھام لیے مگر حنیف پہلوان کو ایسے گھورنے لگا جیسے اس کے بازو حرکت میں آنے کے لیے بیتاب ہوں اور حنیف پہلوان کو اپنی گرفت میں لے کر اس کی آنکھیں باہر نکالنے دینے کے لیے ہلنے ہی والے ہوں۔

سب جانتے تھے کہ مائی خیری نے تین چار روز سے بھٹی نہیں گرم کی تھی۔ وہ چوک میں نظر آئی تھی نہ بیٹھک کی صفائی کرنے آئی تھی۔ دو دن پہلے چوک والوں میں کسی نے اس کو میاں بتے کے گھر کے اندر جاتے دیکھا تھا مگر باہر آتے ابھی تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ گینڈے کو چار دن سے کھانا ایسا ملا تھا جس کا مزہ اس کی ماں کے ہاتھ کے پکے کھانے سے بالکل مختلف تھا۔ حنیف پہلوان کو بھی یہ سب معلوم تھا۔ اسے گینڈے کی نگاہیں اپنے چہرے پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں اور یوں معلوم ہوا کہ اگر گینڈا اسی طرح دیکھتا رہا تو اس کے تمام سوالوں کے جواب حنیف پہلوان کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ کر نکل پڑیں گے۔ حنیف پہلوان تجربہ کار جواری تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ

بیٹھک کے کاروبار کے متعلق کوئی گفتگو گینڈے کے ساتھ ہوگئی تو سارا کام بگڑ جائے گا۔ ان کہی باتوں میں ایک طلسم ہوتا ہے جو پردہ بن کر سچائی کو ڈھانپے رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ ان کہی بات زبان پر آ جائے تو وہ جھٹلائی بھی جا سکتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہا بھی جا سکتا ہے۔ یہ سب جواری جانتے ہیں کیونکہ چپ کی مُہر ان کے پیشے کا ایک داؤ ہے۔ حنیف پہلوان بھلا اپنے ہاتھ کے پتے کیوں دکھاتا۔ وہ فوراً پلٹا اور بغیر کچھ کہے نعل کا روپیہ ڈبے سے تھیلے میں انڈیل کر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

نور پور کی بستی دودھیا روشنی میں بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ افق کے قریب بادل اس روشنی کا عکس سائے پر بھی ڈال رہے تھے۔ ایک آدھ بارش ہوئی تو سردیاں شروع ہو جاتیں اور حنیف پہلوان کا اکھاڑا پھر جاگ اٹھتا۔

بیٹھک کی بغل میں بی بی کا احاطہ اپنی ہی لمبی دیوار کے سائے سے آدھا ڈھنپا تھا۔ صحن کے عین درمیان ہینڈ پمپ کے نیچے ماسٹر عبدالغفور لنگوٹ کسے نہا رہا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے پمپ کی ہتھی چلاتا اور دوسرے سے نل کا منھ بند کیے رہتا۔ جب سمجھتا کہ سارا پمپ پانی سے بھر گیا ہے تو نل سے ہاتھ اٹھا کر سر اس کے نیچے کر دیتا۔ بھرپور نل کی دھار ریشمی کفن کی طرح اس کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی۔

گینڈا حسبِ عادت بیٹھک سے نکل کر چوک میں آیا۔ یہاں بحث اس بات پر تھی کہ میاں بستا فیکے کو گھر کے اندر کیوں نہیں جانے دیتا جبکہ غیر لوگ یعنی مائی خیری وہیں رہتی ہے، وہیں کھاتی ہے اور وہیں سوتی ہے۔ گینڈے نے یہ باتیں سُنیں مگر یہاں رکا نہیں بلکہ رفیع کی دکان کے سامنے رکھی بنچ کو سیدھا کر حنیف پہلوان کے گھر کی طرف چلا۔

گلی سے دیکھا جائے تو حنیف پہلوان کا گھر ایک اونچی اور سیدھی دیوار معلوم ہوتا تھا جس کے درمیان ایک دروازہ جڑا تھا۔ یہ دروازہ ایک ڈیوڑھی میں کھلتا تھا اور اس کا دروازہ بہت وسیع صحن میں۔ یہ اندرونی دروازہ بند رہتا تھا تا کہ کوئی گھر کے اندر جھانک نہ سکے۔ اصل مکان صحن کے پار تھا۔ ایک برآمدے کے پیچھے کئی کمرے ایک قطار میں بنے تھے۔ صحن میں ایک طرف زینہ تھا جو چھت کے اوپر ایک دالان میں جاتا تھا۔ اس کے قریب ہینڈ پمپ لگا تھا اور برابر باورچی خانے کا دروازہ تھا اور اس کے برابر غسلخانہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں چولھے ہینڈ پمپ کے قریب صحن میں بن جاتے تھے اور یہیں بہت سی پیڑھیاں بچھی رہتی تھیں جن پر آنے جانے والی ہمسائیاں آ بیٹھتی تھیں اور بی بی اور اس کی لڑکیاں بیٹھی سینے پرونے کا کام کرتیں اور کھانا پکانے میں ماں کا ہاتھ بٹاتیں۔ اگر باہر کے دروازے کھلے رہتے تو چق کے اندر سے سارا گھر بآسانی نظر آ جاتا تھا۔

گینڈے نے دروازہ بند پایا اور چق اٹھا کر بڑے زور سے دستک دیتے ہوئے، دروازے پر مکّوں کی بارش کرنے لگا۔ اس کی دستک سے سارا محلہ گونج اٹھا اور صحن کے پار سے ایک لڑکی تیز آواز سے بولتے لفظوں کو کھینچ کر بے تحاشا لمبے کرتے ہوئے گینڈے تک آئی کہ ''کون ہے؟''

''میں!'' گینڈے نے کہا اور اس آواز کی لغزش سے اس کے جسم میں جھرجھری آ گئی۔ ''میں... گینڈا پہلوان'' اس نے کہا اور صحن سے تین چار بے پناہ قہقہے بلند ہوئے۔ گینڈا بھی مسکرایا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

ایک لڑکی کے ننگے پاؤں بھاگنے کی چاپ قریب آنے لگی۔ ڈیوڑھی کا صحن والا دروازہ جھٹ سے کھلا اور پھر گلی والے دروازے کی چٹخنی چٹ سے اتری، اور پھر وہی پہلے والی آواز ہنسی میں دبی ہوئی قریب سے آئی: ''کون ہے؟''

گینڈے نے دیکھا، ایک ورزشی جسم کی دلہن ہے، سرخ ڈوپٹہ، کانوں میں ننھی ننھی بالیاں اور بھرے بھرے جسم پر کپڑے یوں تنے ہوئے جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہو اور، اپنی ہنسی کو روکنے کے لیے کلچہ سا ہاتھ موٹے موٹے ہونٹوں والے کھلے منھ پر رکھے، یہ بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہی ہے اور چق کے پار عین اس کے قریب کھڑی ہے۔ گینڈے کی سانس جلدی جلدی چلنے لگی۔ اس نے کانپتا ہوا ہاتھ چق کے پیچھے ڈال کر اپنی مٹھی عین اس کی پوپلی سی ناک کے نیچے لا کر کھول دی۔ اس کی مٹھی سے پانچ روپے پسینے میں ڈوبے ہوئے اچھلے اور ڈیوڑھی میں چھنا چھن کرتے بکھر گئے۔

یہ بڑی مٹھی جب اس کے سامنے جھٹ سے کھلی اور روپے اچھلے تو لڑکی ڈر کے مارے بدک اٹھی اور چلائی، ''ہائے رے نامراد!'' اور چھلانگ لگا کر ڈیوڑھی کے دروازے تک پہنچ گئی۔ پھر جو نگاہ اٹھا کر ایک بار گینڈے کا کھلا منھ اور کانوں تک جاتی ہوئی مسکراہٹ دیکھی تو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔

''صفیہ! زکیہ! اِدھر آؤ، تمھیں ایک چیز دکھاؤں،'' وہ لڑکی چلائی اور گینڈے نے دیکھا کہ صحن کے پار والے دالان سے دو اور ملائم ملائم دلہنیں چلی آ رہی ہیں — بوٹے بوٹے قد، تنی ہوئی گردنیں اور سر پیچھے کو جھکے ہوئے، گلابی گلابی چہرے اور جلد ایسی کھنچی ہوئی کہ سوئی مارو تو سرخ سرخ خون کے فوارے چھوٹ پڑیں۔ پہلوانوں کی طرح سینے

تانے، ڈولتے ہوئے چل رہی تھیں اور ان کی گردنیں اور سریوں جھٹکے دیتے تھے جیسے لقا کبوتر چلے آ رہے ہوں۔ گینڈے کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ اس کی کھلی ہتھیلی ابھی تک چق کے اندر تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے چق تھام رکھی تھی۔

"ہائے میں مرجاؤں، یہ کون ہے؟" ایک نے کہا اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔

"پہلوان ہے نامراد یا لوہاروں کا ہتھوڑا؟" دوسری نے کہا۔

"گینڈا پہلوان نام بھی چن کر رکھا ہے کسی نے،" تیسری نے کہا اور تینوں آپس میں یوں لپٹ گئیں جیسے ہر ایک اپنی جگہ گینڈے سے پناہ مانگ گئی ہو۔ "مگدر ہے نامراد، مگدر!" تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ گینڈے نے آستین پر اپنی گرتی ہوئی رال پونچھی اور ہنسنے لگا۔

"ہنس رہا ہے کمبخت!" ایک نے دوسری کو بھنیچتے ہوئے کہا اور تینوں پھر سے قہقہے لگانے لگیں۔

جتے ڈھول والے کا یہ روز کا راستہ تھا۔ وہ دور سے سب باتیں سنتا آ رہا تھا اور تینوں لڑکیوں کا ٹھٹھا مذاق اور گینڈے کے چہرے کی حیوانیت دیکھ کر وہ ذرا گینڈے سے رگڑ کر گزرا اور ساتھ ہی دبی زبان سے کہہ گیا:

"نری ملائی ہے، ملائی اور مکھن!" پھر چوک کی طرف چلا گیا۔

گینڈے نے پلٹ کر اسے دیکھا اور زور سے ہنس دیا اور اس کے منہ میں برفی کا مزہ آ گیا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تینوں دلہنوں کو ایسے دیکھنے لگا جیسے ابھی اندر جا کر ان

کو بھینچ کر جان سے مار دے گا۔

حنیف پہلوان کی بیوی دالان میں بیٹھی ان لڑکیوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ گینڈا سودا لا کر دینے کے لیے آئے گا۔ اب ان کی باتیں سن کر اسے بھی گینڈے کو دیکھنے کا ایسا شوق ہوا کہ اپنی لڑکیوں کو کوستی ہوئی چلی آئی۔

''بیچارہ مائی خیری کا بیٹا سودا لے کر دینے آیا اور ان بدبختوں نے اس کی ہنسی اڑانا شروع کر دی ہے۔''

مگر جوں ہی اس کی اپنی نگاہ گینڈے پر پڑی، اس کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا، ''ہائے خائے، اللہ توبہ ہے! آدمی کا بچہ ہے یا سچ مچ کا گینڈا ہے۔''

لڑکیوں نے اس کا ناک نقشہ گنوانا شروع کر دیا اور حنیف پہلوان کی بیوی چق کے عین برابر کھڑی اس کے ایک ایک عضو کے متعلق اپنی بیٹیوں کی تشبیہیں سن کر انھیں ایسے دیکھتی جیسے ان کی تصدیق کر رہی ہو۔ اس کی نگاہ گینڈے کی آنکھوں تک آئی تو اسے محسوس ہوا کہ ٹپکتی رال کے ساتھ ساتھ گینڈا اس کے جسم کے ایک حصے پر ٹکٹکی باندھے ہے۔ اس نے بے اختیار یوں ہاتھ اوپر اٹھائے جیسے اپنا ڈوپٹہ سینے کے اوپر کھینچنا چاہتی ہو، مگر ڈوپٹہ وہاں نہ تھا۔ گینڈا بے اختیار ہنستے ہوئے، جیسے اسے کوئی گدگدی کر رہا ہو، اپنی آستین پر رال پونچھنے لگا۔ اس نے حنیف پہلوان کی بیوی کو آنکھ میں آنکھ ڈال کر جب دیکھا تو اس کو گینڈے کی آنکھوں میں ایسی حیوانیت دکھائی دی اور سارے جسم میں ایک ایسی جھرجھری آئی کہ اس کی روح تک کانپ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یکدم اس کے تمام کپڑے اتار دیے گئے ہوں اور وہ الف ننگی ہو گئی ہو۔ بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اس

نے دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور اپنی لڑکیوں کو جھڑکنا شروع کر دیا کہ ''پرائے مردوں کو دیکھ کر ایسے لوٹ پوٹ ہونا شریف زادیوں کا کام نہیں ہے۔ نہ سر پر ڈوپٹہ، نہ پاؤں میں جوتا، اور گینڈا گینڈا کیے جا رہی ہیں۔ جاؤ باورچی خانے سے تھالی اور صافی لا کر دو اسے، سودا لائے،'' اس نے اپنی لڑکیوں سے کہا۔ پھر زمین پر روپے دیکھ کر پوچھا، ''یہ کہاں سے، آئے ہیں؟'' اور انھیں چُننے لگی۔

لڑکیوں نے جاتے ہوئے بتایا کہ یہ گینڈے کی مٹھی سے گرے ہیں جو گرز کی طرح اس نے رقیہ کی ناک کے نیچے ہلائی تھی۔

''کمبخت کہیں کی!'' حنیف پہلوان کی بیوی نے کہا۔ ''بات کرنے سے نہیں ٹلتیں۔ جوانی کیا چڑھی ہے، ان کی آنکھوں میں شرم حیا ہی نہیں رہی۔'' اور پھر نہایت احتیاط سے چٹخنی ایسے کھولی کہ آواز نہ آئے اور دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر پانچ روپے گینڈے کو دیتے ہوئے کہا، ''لے بیٹا! یہ لڑکیاں تو یوں ہی مذاق کرتی ہیں۔''

گینڈے نے گورے گورے ہاتھوں سے پانچ روپے لینے کے لیے اپنا ہاتھ چق کے نیچے دیا تو پٹ ذرا اور کھل گیا۔ گینڈے کی نگاہیں پھر وہیں جم گئیں جہاں پہلے جمی تھیں اور اسے پھر گدگدی ہونے لگی۔ باریک ململ کے کُرتے کے نیچے حنیف پہلوان کی بیوی کا جسم دیکھ کر اسے صمدو کشمیری کے بیل کی آنکھوں پر چمڑے کی دو مخروطی ٹوپیاں بندھی ہوئی یاد آئیں۔

حنیف پہلوان کی بیوی نے نگاہ بھر کر ایک بار پھر گینڈے کو دیکھا اور کپکپاتی آواز میں سودے کی تفصیل اسے سمجھائی۔ اس کو جیسے گینڈے کی خواہشات سے خوف بھی

آ رہا ہو اور لطف بھی۔ وہ چھپتی بھی جاتی اور بات بھی لمبی کرتی جاتی۔ اس کی بیٹیاں صافی اور تھالی لے کر آئیں تو اس نے پٹ جھٹ بند کر دیا جیسے اسے گینڈے کے ساتھ بات کرتے پکڑے جانے کا اندیشہ ہو، اور پھر ذرا سا کھول کر تھالی اور صافی اسے تھماتے ہی دروازے میں چٹخنی چڑھا کر یوں پلٹی اور ایسی تیزی سے صحن پار کرنے لگی جیسے اس کے پیچھے بھوت آ رہے ہوں۔ وہ ایسی گھبراہٹ میں لوٹی کہ دالان تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا۔

دروازہ بند ہوا تو گینڈا سودا لینے ایسے چلا جیسے میلے پر جا رہا ہو، اور چوک میں واقعی میلہ سا لگا تھا۔ ایک طرف تو امینہ اور میاں محمد طفیل کے معاملے پر گرما گرمی تھی۔ خبر آ چکی تھی کہ تصفیہ ہو گیا ہے اور بستا سات سو روپے پر مان گیا ہے۔ دوسری طرف حسے ڈھول والے نے حنیف پہلوان کے دروازے پر جو کچھ دیکھا تھا، جو قہقہے سنے تھے، گینڈے کی جو حالت دیکھی تھی، لڑکیوں کو جس رنگ میں دیکھا تھا، اس میں کچھ اپنی رائے، کچھ اپنا تخیل اور کچھ رنگ ملا کر گینڈے کے آنے سے پہلے ایک معاشقے کی داستان سارے چوک کو سنا دی تھی۔ چوک والے باغ باغ ہو رہے تھے اور گینڈا ایسے آیا جیسے حسے کے بیان کا ایک ایک حرف درست ہو۔

گینڈے کو دیکھ کر رانجھا حجام اسے سنا کر خوب زور سے کھانسا۔ گینڈے نے اس کی طرف دیکھا اور ہنس دیا۔ رفیع پان والے نے آواز دی:

"گینڈے پہلوان، اب ہم سے بات بھی کرے گا یا نہیں؟"

گینڈا بدستور اپنی گدگدی پر "کھی کھی" کرتا اس کی دکان کی طرف چلا۔ راستے

میں نورے کی دکان پر اسے تازہ برفی نظر آئی اور اس نے رک کر ہاتھ بڑھایا اور مٹھی بھر لی۔ اس پر نورے نے کہا، ''گینڈا پہلوان! آج تو تُو ہمیں برفی کھلا۔ ہم سے کیوں کھاتا ہے؟'' چاروں طرف چوک والے خوب ہنسنے لگے۔ اِدھر ایک لڑکے نے آ کر گینڈے سے ایسے بات شروع کی جیسے اس کو کسی بڑے نے خوب سمجھا کر اور فقرے یاد کرا کے بھیجا ہو۔ اس نے کہا، ''گینڈے پہلوان! مبارک ہو، مگر یہ بتادو کہ ایک کرو گے یا دو کرو گے یا تین کرو گے یا ان کی ماں سے بھی کرو گے؟'' سارا چوک قہقہے سے گونج اٹھا۔ گینڈا بھی زور زور سے ہنسنے لگا اور برفی بجائے اُپنے منھ میں ڈالنے کے اس نے اس لڑکے کے منھ میں ڈال دی۔

''ابے حلوائی کی دکان پر نانا جی کا فاتحہ کرتا ہے؟'' نورا چلایا۔

گینڈے نے حنیف پہلوان کے پانچ روپوں میں سے ایک روپیہ نورے کی جھولی میں پھینک کر کہا، ''تو پیسے لے لے یار!''

''ہت تیرے کی! یہ بات ہے گینڈے پہلوان؟'' نورا گویا گاتے ہوے بولا۔

''ارے آخر حنیف پہلوان کا جوائی ہے۔ کوئی مذاق ہے!'' رفیع پان والے نے کہا اور گینڈا ہنسی خوشی اس دکان سے یہ خرید اور اُس سے وہ، جو جی میں آیا لے کر چلا۔ نورا پھر چلّایا:

''حنیف پہلوان کے جوائی، لے جا اپنا روپیہ! ہم تو اب شگون میں ہوگا تو اس کی مٹھائی کھائیں گے۔ یہ لے جا روپیہ۔'' اور اس نے روپیہ لوٹانے کے لیے اشارہ کیا۔

''ابے رکھ لے،'' رفیع پان والے نے کہا۔ ''یہ بھی رکھ اور شگون کی مٹھائی بھی

بنا!'' اور پھر اس نے گینڈے سے پوچھا، ''کیوں گینڈے پہلوان؟ ٹھیک کہا یا نہیں؟''

گینڈے کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور سارا چوک قہقہوں پر قہقہے لگا رہا تھا۔ ہر طرف سے مبارک مبارک سنتا گینڈا سودا لیے حنیف پہلوان کے گھر واپس چلا۔

گینڈے نے حنیف پہلوان کے گھر پہنچ کر پھر دستک دی مگر اب کے کچھ اعتماد کے ساتھ اور بغیر کسی کے پوچھے کہ کون ہے، پٹ فوراً کھلا اور حنیف پہلوان کی بیوی نے، جو اَب ڈوپٹہ بھی اوڑھے تھی، پوری سامنے آ کر سودا لے لیا اور گینڈے سے کہا، ''ذرا رک جاؤ، میں نے حلوہ پکایا ہے، وہ لیتے جاؤ۔ کھالینا۔''

حنیف پہلوان کی بیوی مڑی اور ڈیوڑھی سے صحن میں گئی اور صحن پار کر کے باورچی خانے میں پہنچی۔ گینڈا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہلتے ہوئے کولھے دیکھتا رہا اور صحن کی تیز روشنی میں ململ کی قمیض سے اس کے گورے گورے شانے دیکھتا رہا۔ حنیف پہلوان کی بیوی جب حلوہ دیگچی میں سے طشتری میں ڈالنے لگی تو اس کا ڈوپٹہ گر گیا۔ اس نے چمچ چھوڑ کر ڈوپٹہ باقاعدہ اتار کر الگ رکھ دیا اور طشتری میں حلوہ ڈال کر بغیر ڈوپٹے کے لوٹی۔ گینڈے نے اسے صحن پھر پار کرتے ہوئے دیکھا اور سورج کی تیز روشنی میں ململ کے کرتے کے نیچے چمکتا ہوا جسم دیکھا اور صمدو کے بیل کی آنکھوں پر مخروطی ٹوپیاں دیکھیں اور اس کی رال پھر ٹپکنے لگی۔ اس کو پھر گدگدی سی ہونے لگی۔ ابھی حنیف پہلوان کی بیوی صحن سے ڈیوڑھی کا دروازہ پار کرنے نہیں پائی تھی کہ کسی نے چق اٹھائی۔ حنیف پہلوان کی بیوی ذرا ٹھٹکی۔ پھر اس پر گویا بجلی گر گئی۔ پھر سنبھل کر بولی، ''تو آ گئی مائی خیری! وہ لڑکی اب کیسی ہے؟''

''اس کا تو فساد پڑ گیا ہے بی بی۔ پر میں نے سوچا بی بی کو سودا تو لے کر دے آؤں،'' مائی خیری نے کہا۔

گینڈا مائی خیری کو ایسے گھورنے لگا جیسے اسے جان سے مار ڈالے گا۔

''سودا تو آج تیرے بیٹے نے لادیا ہے،'' حنیف پہلوان کی بیوی نے کہا۔

''یہ لے، اسے حلوے کی طشتری دے دے،'' یہ کہہ کر حنیف پہلوان کی بیوی صحن میں ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے یوں چھپ گئی جیسے گینڈے سے پردہ کر رہی ہو اور گینڈے نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔

مائی خیری نے طشتری پکڑ کر گینڈے کے آگے کر دی۔ گینڈے نے پہلے مائی خیری کو گھورا اور پھر حلوے کو گھورنے لگا۔ گھورتے گھورتے اپنا پنجہ سا ہاتھ بڑھا کر اس نے طشتری پر مارا اور سارے کا سارا حلوہ مٹھی میں لے کر حنیف پہلوان کی بیٹھک پر جانے کے بجائے مہر جیون کے احاطے کی طرف چل دیا۔

گینڈا مٹھی میں حلوہ لیے یوں چلا جارہا تھا جیسے کوئی خواب میں چل رہا ہو۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور رال ٹپک ٹپک کر گرتے پر گر رہی تھی۔ وہ ایسے ہانپنے لگا جیسے گرمی سے کوئی کتا ہانپ رہا ہو۔ چوک والوں نے اسے دیکھا اور حلوہ بھی دیکھ لیا۔ ایک نے آواز دی:

''شگون ہو گیا، گینڈے پہلوان!''

گینڈے نے نہیں سنا۔ وہ تو سوتے میں چل رہا تھا۔

دوسرے نے آواز دی، ''ساس نے حلوہ کھلایا ہے پہلوان!''

گینڈے نے نہیں سنا۔ دونوں آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں، مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔ وہ زمین پر نہیں بلکہ ہوا پر چل رہا تھا۔ اور چلنا بھی ایسا عمل تھا جو اسے چاروں طرف کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ سائے سائے سے تھے مگر بے معنی۔ معنی چار جسموں میں تھے جو سایوں کی طرح سامنے آتے اور نکل جاتے تھے۔ انھیں وہ پہچانتا تھا۔ باقی سائے بہت دھندلے تھے، انھیں وہ نہیں پہچان سکتا تھا۔ احاطے میں وہ کیسے پہنچ گیا، اپنی کوٹھڑی میں کیسے آیا اور وہاں زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر کب لیٹا، یہ بھی اَدھ جانی باتیں تھیں، مگر وہ چار جسم لوٹ پوٹ ہوتے ایک بڑا سا گولہ بن گئے جو اس کی مٹھی میں حلوے کی طرح تھا۔ گینڈا اس حلوے کو اپنی مٹھی میں مسلتا رہا اور یہ گداز حلوہ اس کی مٹھی میں سے انگلیوں کے بیچ بیچ سے پھوٹ کر نکلتا رہا اور اسے گدگداتا رہا۔ اس کی رال ٹپکتی رہی اور حلوہ مٹھی میں سے کم ہوتا رہا حتیٰ کہ ہاتھ کو محض بہت سا شیرہ لگا ہوا رہ گیا۔

گینڈے کے ذہن پر اندھیرا سا چھا گیا اور اس میں روشنی کے چھوٹے چھوٹے داغ ابھرنے لگے۔ جب کوئی نیا داغ ابھرتا تو گینڈے کو ایک سوئی سی چبھتی۔ آہستہ آہستہ یہ سوئیاں اتنی زیادہ ہوگئیں کہ گینڈا ان کی تاب نہ لا سکا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنے ہاتھ پر چمٹی ہوئی ہزاروں چیونٹیاں جھاڑنے لگا۔

16

اگلے روز چوک والوں نے پروگرام بنایا کہ نھو کی بیٹھک پر کباب بنا کر کھائے جائیں اور اس سلسلے میں رانجھے حجام کے پاس دو دو چار چار آنے جمع کروا دیے۔ رانجھا کباب بنانے میں استاد مانا جاتا تھا اور اسے مرچ مسالوں کے وہ نسخے یاد تھے کہ خلیفہ کبابیے کو کیا معلوم ہوں گے۔ اس نے صبح صبح تمام چیزیں جمع کر لی تھیں — نہایت بڑھیا ادرک، سبز دھنیا، کراچی کا پیاز اور لہسن، اجوائن اور سیاہ مرچ، بڑی الائچی اور کشمیری زیرہ۔ فیکے اور رُلدو کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ پیاز کتریں، مسالہ تیار کریں، اور خود صحیح قسم کا گوشت لینے چلا گیا۔

دوپہر تک تمام تیاری مکمل ہو گئی۔ سب چوک والے ایک ایک دو دو کر کے بیٹھک پر پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ امینہ کے قصے اور اس قضیے کے تصفیے پر تبادلۂ خیال کرتے رہے اور پھر جب پھوار پڑنے لگی تو کوئی غزل گانے لگا، کسی نے فلمی گیت سنایا۔ نھو نے کلارنٹ اٹھالی اور عمدہ عمدہ دھنیں بجانے لگا۔ کباب بنانے کا کُل سامان تیار تھا۔ قیمہ اور مسالے ملا رکھے تھے۔ انگیٹھی میں کوئلے بھرے تھے اور سب کو گینڈے کا انتظار تھا کیونکہ سیخیں اسے حنیف پہلوان کی بیٹھک سے لانا تھیں۔ بس وہ آتا تو کوئلے دہکائے جاتے اور خستہ گرم گرم کباب کھانے کا دور شروع ہوتا، مگر وہ تھا کہ آنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

''وہ تو آج اپنے سسرال گیا ہوگا،'' کسی نے کہا۔

''صبح تو وہ مہر جیون کے احاطے کی طرف چلا گیا تھا،'' رفیع پان والے نے بتایا۔

''میں نے تو اسے بیٹھک پر جاتے دیکھا نہیں۔''

''معلوم نہیں کدھر مر گیا ہے!''

''چک کے آگے کھڑا اپنی سالیوں سے مسخریاں کر رہا ہوگا یا ساس کے پاس حلوہ کھا رہا ہوگا۔''

سب ہنستے تو رہے مگر انھیں تشویش ہونے لگی تھی کہ دوپہر سے سہ پہر ہوگئی اور اگر گینڈا اسیخیں نہ لایا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔

کچھ دیر کے بعد متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ حسا گینڈے کو ڈھونڈ کر لائے یا کم از کم اس سے سیخیں لے آئے۔ حسا گینڈے کو ڈھونڈنے پہلے تو مہر جیون کے احاطے میں گیا۔ وہاں کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا مگر گینڈا نہیں تھا۔ پھر حنیف پہلوان کے گھر کے آگے سے ہوتا ہوا بیٹھک پر پہنچا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا، سب کھڑکیاں بھی کھلی تھیں اور اندر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے کوئی سازش کی جارہی ہو۔ ان کی باتیں سننے کے لیے حسا ایک کھڑکی کے سامنے کھڑا گویا رکوع میں چلا گیا اور اپنے سامنے کی خاک کو ایسے گھورنے لگا جیسے اس کی کوئی بڑی مہین شے یہاں کھوگئی ہو اور وہ اسے اپنی پوری کوشش سے ڈھونڈ رہا ہو، اور یہاں کھڑے کھڑے اس نے وہ کچھ سنا جو سارے چوک میں اور کسی کو معلوم نہیں تھا، اور کبھی معلوم نہ ہو سکتا اگر حسا یہاں عین اِس وقت نہ پہنچتا۔

اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ اندر میاں محمد طفیل بی اے ہیں، میاں بستا ہے، مقامی

تھانیدار ہے، مہر جیون اور سائیں بھولا ہیں۔ امینہ رو رہی ہے اور دو ایک آدمی اسے کچھ سمجھا رہے ہیں، اتنے میں ایک تانگہ آ کر بیٹھک کے سامنے رکا۔ اس میں سے مائی خیری اور ایک اَور عورت اتر کر بیٹھک کے اندر گئیں۔ حسّا تانگہ دیکھ کر مکان کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کا ذہن اس چکر میں پھنس گیا کہ یہ مائی خیری اور امینہ اور میاں بسّا یہاں پہنچ گئے مگر کسی کو خبر تک نہیں ہوئی اور یہ سب باتیں کب اور کیسے طے ہو گئی ہیں۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ گینڈا باہر آ گیا۔ حسّا لپکا اور گینڈے کا بازو تھام کر پوچھا، ''گینڈے پہلوان، یہ کیا ہو رہا ہے؟... اور وہ سینگیں...''

گینڈا مسکرایا۔ ''ٹھہر جا، سینگیں لے جا۔ میں امینہ کو وداع کر کے آتا ہوں!''

'وداع' حسّے کے گلے میں اٹک گیا مگر گینڈا تانگے والے کو رکنے کی ہدایت کر کے خود چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد حسّے نے دیکھا کہ مائی خیری اور اس کے ہمراہ جو بڑھیا آئی تھی، امینہ کو دونوں بازوؤں سے تھامے ساتھ لیے باہر آئیں اور اسے تانگے میں بٹھا کر خود بھی سوار ہو گئیں۔ ان کے بعد باقی سب لوگ باہر نکلے اور امینہ کو دلاسا دینے لگے کہ ''کوئی فکر کی بات نہیں، چار نہیں تو پانچ روز میں خود اپنے پاؤں پر چل کر گھر آ جائے گی۔'' مائی خیری کے ہمراہ آنے والی بڑھیا کے چہرے پر نہ کوئی حیرانی تھی نہ کسی قسم کی پریشانی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی، ''یہ بھی کوئی بات ہے۔ منٹوں کا کھیل ہے۔ ہم نے تو ایسے ایسے کیس کیے ہیں جو اسپتال والوں نے بھی منع کر دیے تھے۔''

تانگہ چل پڑا اور حسّا مکان کی اوٹ میں چھپا باقی لوگوں کے جانے کا انتظار کرنے

لگا۔ تھانیدار نے اپنا بازو بڑے دوستانے میں میاں بتے کے کندھے پر رکھا اور اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ میاں محمد طفیل بی اے اور حنیف پہلوان اور دوسرے لوگ گھوڑے شاہ کے مزار کے پار جا کر تانگے کا انتظار کرنے لگے۔ گینڈا سیخیں لے کر آیا اور حسے کو آواز دی۔ حسا ایسے چونکا جیسے کوئی چور پکڑا گیا ہو۔ اس نے سیخیں لیں اور بھاگا، اور بجائے سیدھے راستے جانے کے، بی بی کے احاطے کی طرف ہولیا جیسے چھپ کر جا رہا ہو۔

وہ دو قدم ہی گیا تھا کہ احاطے کے دروازے کے باہر اسے ماسٹر عبدالغفور کھڑا ملا، اور اسے دیکھتے ہی حسے کو خیال آیا کہ اگر اس کے بس کی بات ہوتی تو میاں بتے، مہر جیون، حنیف پہلوان، میاں محمد طفیل اور مائی خیری کو گولی سے اڑا دیتا اور ماسٹر کی امینہ لا کر اس کے قدموں پر رکھ دیتا۔ کئی مرتبہ اس نے ماسٹر کی باتیں، تعلیم کے فوائد اور بیکار پھرنے کے نقصانات سنے تھے اور اکثر ماسٹر عبدالغفور کا دل رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اس وقت حسے کا جی چاہا کہ اسے امینہ کی بیماری کا تمام قصہ سنا دے اور اس بیماری کے ذمے داروں کے نام بھی بتا دے۔ مگر اسے ماسٹر پر اتنا ترس آیا کہ یہ کچھ نہ کہہ سکا، البتہ خواہ مخواہ اسے یہ بتانے لگا کہ ''ماسٹر جی! ہم لوگ کباب بنا رہے تھے اور سیخیں نہیں مل رہی تھیں۔ وہ میں گینڈے پہلوان سے لینے آیا تھا۔'' پھر یکدم حسے کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے ماسٹر عبدالغفور سے کہا، ''اور پھر ماسٹر جی! انھوں نے کہا تھا کہ ماسٹر جی سے کہنا، وہ بھی کباب کھانے آئیں۔'' شکر یہ ہے کہ ماسٹر نے یہ نہیں پوچھا کہ تقریب کیا ہے۔ اگر پوچھ لیتا تو حسا تقریب کیا بتاتا؟ بقول گینڈا پہلوان، امینہ کے وداع کی تقریب؟

''بہت اچھا!'' ماسٹر عبدالغفور نے کہا۔

حسّے کو خیریت اسی میں معلوم ہوئی کہ جلدی سے چل دے، مگر وہ ابھی ایک قدم بھی نہ چلا تھا کہ ماسٹر عبدالغفور نے کہا، ''ٹھہر جاؤ میاں حسّے، میں تمھارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔''

حسّے پر بجلی ہی گر گئی — اس نے جو خبریں اتنی محنت سے جمع کی تھیں وہ نہیں سنا سکے گا۔ ''میرا بڑا انتظار ہو رہا ہوگا ماسٹر جی! سیخیں میرے پاس ہیں نا۔ میں نہ پہنچوں تو کباب کیسے لگیں گے؟'' حسّے نے جان چھڑانا چاہی مگر ماسٹر عبدالغفور نے کہا، ''تو میں کپڑے نہیں تبدیل کرتا، ایسے ہی چلتے ہیں،'' اور حسّے کے ساتھ ہولیا۔

حسّے اور ماسٹر عبدالغفور نے ابھی بیٹھک کی دہلیز پار نہیں کی تھی کہ سب چوک والے بھوکے اچھلے اور دو دو سیخیں حسّے سے چھین کر ہر ایک اپنے لیے خود کباب بنانے دوڑا۔ نھّو تکیے کی ٹیک لگائے کلارنٹ بجا رہا تھا۔ کلارنٹ بجاتے بجاتے اس نے حسّے اور ماسٹر عبدالغفور کو دیکھا۔ حسّے کے چہرے پر لکھا تھا کہ بڑی اہم خبر ہے جو اس کے پیٹ میں سما نہیں رہی ہے، مگر ماسٹر کی موجودگی میں نہیں سنائی جا سکتی۔ بہر حال، ہر ایک کو حیرت ہو رہی تھی کہ ماسٹر یہاں کیسے آ گیا، مگر کوئی بول نہیں رہا تھا۔ ماسٹر نے سب کی پریشانی دیکھی تو بیٹھک کے ایک کونے میں ہو گیا اور پرانے اخبار کا ایک ٹکڑا اٹھا کر، جس میں شاید کوئی مسالہ آیا تھا، اور اسے جھاڑ کر پڑھنے لگا۔ حسّے نے موقع دیکھا تو نھّو کے اوپر دوہرا ہو گیا اور اس کے کان میں بتانے لگا کہ امینہ ایک دائی اور مائی خیری کے ہمراہ تانگے میں بیٹھ کر کہیں گئی ہے۔ اب میاں بستا کہے گا کہ وہ اپنے ماموں کے ہاں گئی ہے جس کے بیٹے

کے ساتھ اس کی سگائی ہو چکی ہے، حالانکہ وہاں وہ نہیں گئی، کہیں اور گئی ہے۔ سب انتظام مائی خیری نے کیا ہے اور تھانیدار کی مدد سے میاں محمد طفیل بی اے نے میاں بستا کو کچھ روپیہ دیا ہے جس سے وہ امینہ کی شادی کے لیے جہیز بنائے گا، اور جونہی امینہ سب ٹھیک ٹھاک کروا کر لوٹے گی، اس کے ماموں کا بیٹا آ کر اس کو بیاہ کر لے جائے گا۔ اور مائی خیری کو بھی روپیہ ملا ہے، اور تھانیدار کو بھی، اور گینڈے کو ان تمام باتوں کا علم ہے، اور حسّے نے یہ سب کچھ کھڑکی سے باہر کھڑے سنا ہے اس لیے اسے دیر بھی ہو گئی ہے، اور ماسٹر کو ہمراہ لانا ضروری تھا کیونکہ اس بیچارے کو کچھ پتا نہیں ہے کہ اس کی امینہ کو کیا ہوا ہے...

یہ خبریں چند لمحوں میں ایک منھ سے دوسرے کان اور دوسرے منھ سے تیسرے کان پہنچیں اور سب کے منھ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ ماسٹر اخبار کے ٹکڑے سے نظر ہٹا کر دیکھتا کہ کانا پھوسی ہو رہی ہے مگر چپ رہتا اور پھر اخبار پڑھنے لگتا۔ بہر حال، جلد ہی سوائے ماسٹر اور فیکے کے، سب کو تمام واقعات کا علم ہو چکا تھا اور سب ماسٹر سے اس قدر متاثر معلوم ہوتے تھے کہ ان کا بس چلتا تو اسے گلے لگا کر رو لیتے۔ جب ہر ایک آ آ کر ماسٹر کو کباب دینے لگا اور اسے اتنی توجہ ملنے لگی کہ وہ پریشان سا ہو گیا تو اس نے پوچھ لیا کہ یہ کباب اسے کس تقریب پر کھلائے جا رہے ہیں۔ یہ سوال ایسا حیرت انگیز تھا کہ سب ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے اور کباب کی سیخیں ان کے ہاتھوں میں پکڑی کی پکڑی رہ گئیں۔ نتھو اور رُلدو نے اپنے ذہنوں پر بہت زور دیا مگر انھیں کوئی جواب نہ سوجھا۔ آخر حسّے کی ذہانت کام آئی۔ اس نے کہا:

''ماسٹر جی! آج فیکے کا ختنہ ہوا ہے۔''

ماسٹر نے حسرت بھری نگاہوں سے فیکے کی طرف دیکھا جس میں ہمیشہ اسے امینہ کا سایہ نظر آیا کرتا تھا، مگر باقی سب ایسے کھلکھلا کر ہنسے اور ایسے قہقہے لگانے لگے کہ ماسٹر شرم کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ اس پر ظلم یہ ہوا کہ عین اسی وقت گینڈا پہلوان ہوا میں تکتا داخل ہوا۔ اس کے آتے ہی قہقہے یکلخت رک گئے مگر کسی نے بلند آواز سے پوچھا،

''ہو گیا وداع؟''

''ہاں!'' گینڈے نے بدستور ہوا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ سب مڑ کر اس بیوقوف کو قہر کی نظروں سے دیکھنے لگے جس نے سوال پوچھا تھا۔ اگر باقی سب خاموش رہتے تو ممکن تھا وہ بیچارہ مارا جاتا، مگر ماسٹر نے پلٹ کر پوچھا، ''کس کا وداع؟''

گینڈے نے ماسٹر کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ دی۔ بیٹھک میں اس طرح خاموشی چھا گئی جیسے سب نے سانس تک روک لی ہو، جیسے ہر ایک کو معلوم ہو کہ اب زلزلہ آنے والا ہے اور اس کا انتظار کر رہے ہوں۔ سب کی نگاہیں گینڈے پر جم گئیں اور گینڈے کی ماسٹر پر گڑی رہیں۔ ایک لمحہ گزر گیا، دوسرا پہاڑ ہو گیا اور تیسرے پر گینڈے نے نہایت اطمینان سے کہا، ''امینہ کا!''

ماسٹر کباب چھوڑ چھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور پوچھا، ''کیا بات ہے پہلوان؟'' جیسے اب اس کا دم نکل جائے گا۔ گینڈا سمجھا کہ یہ سوال ہے، اس نے کھڑے کھڑے اسی اطمینان سے جواب دیا، ''وہ ہو گیا تھا نا امینہ کو جو... وہ ٹھیک کروانے اپنے ماموں کے گھر دائی کے ساتھ چلی گئی ہے۔''

ماسٹر عبدالغفور کے منہ سے ایسی چیخ نکلی جیسے کسی نے اس کی آنکھیں نکال ڈالی ہوں اور وہ گرتا پڑتا بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ ماسٹر کے جاتے ہی بیٹھک پر کچھ مُردنی سی چھا گئی اور سب یوں بیٹھ گئے جیسے ماسٹر کا چالیسواں منا رہے ہوں۔ مگر دہکتے کوئلوں پر بھنتے کبابوں سے چربی کے قطرے ننگے کوئلوں پر گر گر کر دھواں دے رہے تھے اور ان کی مہک چوک والوں کو بہت دیر تک مغموم نہیں رہنے دے سکتی تھی۔ ایک نے کباب کی سیخ گینڈے کو تھمائی اور دوسرے نے اَور کباب لگائے، ایک سے دوسرے نے چھینے اور دوسرے سے تیسرے نے، اور چند لمحوں میں کبابوں کی لگن ماسٹر کے غم پر چھا گئی اور خاموشی کی جگہ قہقہوں نے پھر لے لی۔

''تو کباب نہیں کھاتا گینڈے پہلوان؟'' رفیع پان والے نے کہا۔

''یہ کیوں کھائے؟ اسے تو اب حلوے ملتے ہیں!'' نورے نے جواب دیا۔

گینڈا ہنس دیا۔

ایک اَور بولا، ''ارے حلوے کیا، یہ تو جناب حنیف پہلوان کی بیٹھک کی دعوتیں کھاتا ہے۔'' معراج تندور والے نے بتایا کہ ''یہ تو چرغے کھاتا ہے اور پوری پوری رانیں چٹ کر جاتا ہے۔'' گینڈا کھانے میں بہت مصروف تھا۔ اگر ہنستا تو درجنوں کباب جو اس کے منہ میں تھے، ضائع ہو جاتے۔ پھر بھی وہ ناک کے راستے ''ہوں ہوں'' کرتا ہنس رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سب کی توجہ کبابوں کی طرف کم ہوتی گئی اور باتیں کرنے کا موقع زیادہ ملنے لگا۔ پیٹ تو سب کے بھر گئے تھے مگر حرص سب میں باقی تھی۔ نتھو نے گینڈے سے کہا:

''یار گینڈے پہلوان! کبھی ہماری بھی دعوت بیٹھک پر ہو جائے۔''

گینڈا مسکرایا۔

''وہ تو اب گینڈے کے نکاح پر ہو گی،'' رفیع پان والے نے کہا۔

گینڈے کی باچھیں کھل گئیں۔ نتھو نے اصرار کرنا شروع کر دیا۔

''کیوں گینڈے پہلوان! بات کرنا، کب ہوتی ہے دعوت پھر؟ یار، ہمیں بھی ایک دن جشن کرا دے۔''

گینڈا مسکراتا ہوا کچھ سوچ میں پڑ گیا، مگر نتھو اور حسّے نے بات بڑھانا شروع کر دی۔

''ایسا جشن ہو کہ یاد رہے، بس طبیعتیں خوش ہو جائیں،'' رلدو نے کہا۔

''اپنا بینڈ باجہ لے کر سب چلیں یار۔ معراج چرغہ اور بکرے کی چاروں رانیں تندور میں پکا دے۔ بس بالکل ریشم کر دے،'' نتھو نے کہا۔

''کباب ضرور ہونے چاہییں،'' رانجھے نے مشورہ دیا۔

''ارے جہاں مرغ کے چرغے ہوں وہاں کباب کی کیا حیثیت ہے!''

رانجھے نے کبابوں کی طرفداری کی۔ ''سچی بات تو یہ ہے مرشد، کہ کباب شاہی چیز ہے۔ مرچ مسالہ ٹھیک ہو تو کباب کے آگے سب چرغہ ورغہ یہ مٹی کی چٹکی ہے۔'' اس نے زمین سے ایک چٹکی مٹی کی اٹھائی اور ہوا میں غائب کر دی۔ گینڈا بدستور کباب کھاتا ''کھی کھی'' کر کے ہنستا رہا۔ بہت سے کباب کھانے کے بعد جوں جوں پیاس لگی اور ہر ایک نے گلاس پر گلاس پانی کے پینے شروع کیے، سب کو نیند آنے لگی۔ فیکا تو ایک طرف

خرّاٹے بھی لینے لگا تھا۔ باقی لوگ جانے کی سوچ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سب ایک ایک کر کے جانے لگے۔ آخر کار صرف نھو کی بیٹھک کے مستقل لوگ رہ گئے اور وہ بھی فرش پر دراز ہو گئے۔ مگر گینڈا بیٹھا رہا۔ نھو نے پھر اس کو چھیڑا، ''سنا ہے پہلوان، تمھاری بیٹھک پر وہ جشن ہوتے ہیں جو جشن کی شرط ہے، جیسے ایڈورڈ بادشاہ کی تاجپوشی پر ہوئے تھے۔ کیوں، ٹھیک ہے؟''

گینڈے نے ہنستے ہنستے سر ہلایا کہ ''ہاں!''

''اچھا! تو پھر ہمیں بھی کبھی دکھا دے یار،'' اس نے کہا۔

''تو گینڈے پہلوان، اپنی منگنی کی دعوت کر دے،'' حسّے نے کہا۔

''ہم باجہ لے کر چلیں گے اور تیرا جلوس نکال دیں گے،'' رلدو نے سمجھایا۔

''ارے ہاں یار، ٹھیک ہے۔ لڑکی تو مانی ہوئی ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اور اس کی ماں نے حلوہ بھی گینڈے پہلوان کو میرے سامنے کھلایا ہے۔ اب تم بارات لے کر چلو اور حنیف پہلوان کے گھر پہنچ جاؤ۔ پھر تو خود ہی لڑکی دے گا،'' حسّے نے پوری سنجیدگی سے مشورہ دیا اور بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ارے وہ کیا دے گا! تم بینڈ بجاؤ، لڑکی خود آئے!'' نھو نے چرس والی سگریٹ سلگا لی تھی اور زور زور سے کش لگانے لگا۔

''یہ ٹھیک ہے!'' حسّے نے کہا۔

فیکا خرّاٹے لے رہا تھا۔ رلدو اس انتظار میں تھا کہ نھو اسے بھی ایک کش لگا لینے دے۔ ''بس ہو جائے پھر گینڈے پہلوان!'' حسّے نے گینڈے کو چمکانے کی کوشش کی اور

گینڈے کی آنکھوں میں واقعی چمک پیدا ہونے لگی۔ نتھو نے ایک اَور کش لگایا اور سگریٹ رلدو کو دے کر لیٹتے ہوئے کہنے لگا:

''ارے کہاں دعوت کرتا ہے گینڈا پہلوان ہماری۔''

''ایسا نہیں گینڈا پہلوان، استاد!'' حسّے نے کہا۔ ''تم کل ہی دعوت لو۔''

گینڈا مسکرایا اور بولا، ''اچھا کریں گے۔''

رلدو حسّے اور نتھو کے جسموں میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ تینوں ایک ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے، ''سچ مچ؟''

گینڈے نے کہا، ''ہاں!'' اور اٹھ کر بیٹھک سے باہر چلنے لگا۔ نتھو نے آواز دی اور رازدارانہ لہجے میں پوچھا، ''کوئی بوتل ووتل بھی ہوگی؟'' گینڈے نے پھر اسی انداز سے کہا، ''ہاں!'' اور بیٹھک سے باہر نکل گیا، اور اس سے کسی نے یہ نہ پوچھا کہ کب کرے گا۔

17

جیسے نتھو کو گینڈے کے وعدے کا اعتبار نہ آیا ہو، اس نے سرِ شام فیکے کو حنیف پہلوان کی بیٹھک پر بھیجا کہ دیکھ آئے، آیا گینڈا وہاں ہے بھی، اور اگر ہے تو کیا واقعی دعوت وغیرہ کا کوئی انتظام ہے۔ فیکا حنیف پہلوان کی بیٹھک پر پہنچا تو سامنے میونسپلٹی کی لالٹین جلانے والا انور دین لالٹین کے کھمبے سے اپنی سیڑھی لگائے اس پر کھڑا شیشہ صاف کر رہا تھا اور گینڈا بیٹھک کی سیڑھی پر یوں بیٹھا تھا جیسے سچ مچ کا پہلوان ہو۔ گینڈے نے ململ کا نیا کُرتا، اس میں نگینے والے بٹن، سفید لٹھے کی دوپٹ کی چادر اور سر پر کوئی بارہ گز کی پگڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے گلے میں نیا چمکدار تعویذ تھا جس کا سیاہ ڈورا بالکل تازہ بٹا ہوا تھا۔ اس پر مَیل کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ پاؤں میں بالکل نئی دھوڑی کی جوتی تھی جس کا تلا ابھی مٹی سے بالکل پاک تھا۔ گینڈا لالٹین جلانے والے سے بات کر رہا تھا۔

”چاندنی راتوں میں پہلوان، تیل کچھ بچ جاتا ہے۔ حکم یہ ہے کہ چاندنی رات میں بھی بتی جلاؤ، مگر اس کا کیا فائدہ۔ لوگ رپورٹ کر دیتے ہیں نا۔ انھیں اپنے گھر کے لیے تیل جو نہیں ملتا۔ پہلوان، ہمیں کیا بچتا ہے۔ اِدھر بتی جلا کر جاؤ، اُدھر کوئی نہ کوئی آ کر سارا تیل نکال لیتا ہے اور افسر ہمیں پکڑ لیتے ہیں کہ تم نے تیل بیچ لیا اور بتی نہیں جلائی۔ ایمانداری کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔“

فیکے نے گینڈے کو ایسے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو اس سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ قریب تھا کہ وہ پلٹ جاتا مگر گینڈے نے آواز دی، ''فیکے! دوسرے نہیں آئے؟'' فیکے نے گینڈے کو یقین دلایا کہ وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نہ آئیں۔ گینڈا مسکرا دیا۔

نتھو کی بیٹھک پر پہنچ کر فیکے نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ گینڈے نے کُرتے میں نگینے والے بٹن لگا رکھے ہیں اور پگڑی پہنی ہے۔ اس پر نتھو کو کچھ تشویش ہوئی۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ نتھو، حسّا، رلدو اور فیکا، سب ایک ایک بار پھر نہائیں۔ رانجھے کو بھی چلنا تھا، وہ بھی پھر نہائے، اور سب نئے صاف ستھرے جوڑے پہنیں اور نتھو مونچھوں پر موم لگائے۔ بہر حال، اب یہ ضروری ہو گیا تھا کیونکہ گینڈے نے وعدے کے مطابق باقاعدہ انتظام کیا تھا۔ یہ خبر سب تک پہنچی اور سب یوں تیاری کرنے لگے جیسے عید کے روز نماز پڑھنے جانا ہو یا کسی کی بارات میں شامل ہونا ہو۔ سب باری باری سے مسجد جانے لگے اور نتھو کی بیٹھک میں آ آ کر اسی کا تیل سر اور منہ پر ملنے لگے۔ جو کپڑے پہلے سب نے پہن رکھے تھے ان سے جوتے صاف ہونے لگے۔

نتھو کے بینڈ باجے والے اور رانجھا جب چوک میں پہنچے تو انھیں محسوس ہوا کہ کوئی ان کو دیکھ رہا ہے اور ان کی شلواروں کی سر سر سن رہا ہے۔ رفیع پان والے کی دکان سے نتھو نے سوچا کہ پان لیتے چلو۔ یہاں دِینا بھی کھڑا تھا۔ اس نے پوچھ ہی لیا، ''کدھر چلی ہیں فوجیں؟''

''گینڈے کی سگائی پر،'' حسّے نے کہا اور سب نے قہقہہ لگا دیا۔

''لا رفیع پہلوان! آٹھ پان دے دے،'' نھتو نے کہا۔ دِینے نے بات کو ختم نہیں سمجھا۔ اس نے سب کے دھلے ہوئے کپڑے دیکھے اور کچھ باقی آن بان دیکھ کر سوچا کہ یہ ٹھیک ہی نہ کہہ رہے ہوں۔ اس نے پوچھا، ''تو پھر تمھارے باجے کہاں ہیں؟''

نھتو نے دینے کو دیکھا اور اس کی سنجیدگی دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا:

''ہاں بھئی، وہ باجے تو لیے نہیں۔''

سب الٹے پاؤں نھتو کی بیٹھک کو چل دیے اور دو منٹ میں اپنا اپنا باجہ لے کر آ گئے۔

''کیوں دِینے پہلوان، اب تو ٹھیک ہے نا؟'' نھتو نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا اور ٹھنڈی سڑک سے حنیف پہلوان کی بیٹھک کو چل دیے۔ دینا کھڑا کھڑا سوچتا رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کی چھٹی حس اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ دینا اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لے۔ وہ پھر پلٹ کر حنیف پہلوان کے گھر سے ہوتا ہوا بیٹھک کی طرف نکل گیا۔

نھتو اور اس کے ساتھی ڈھول اور باجے لیے حنیف پہلوان کی بیٹھک پر پہنچے تو گینڈا اور میونسپلٹی کی لالٹین جلانے والا نوردین کوئلوں پر تکّے بھون رہے تھے۔ انھوں نے ایک ایک سیخ نھتو اور اس کے ساتھیوں کو بھی تھما دی۔ گینڈا تمام دعوت کا سامان نوردین کو دکھا چکا تھا۔ اس نے گینڈے سے کہا، ''پہلوان، وہ بوتل بھی ہو جائے!''

گینڈا ''ہی ہی ہی'' کرتے اٹھا اور الماری سے بوتلیں اور گلاس نکال کر دالان میں سب کے آگے رکھ دیے۔ نھتو نے ایک گھونٹ پیا اور بے اختیار گینڈے سے بغلگیر ہو

گیا۔ نھو کا جسم ابھی گینڈے کے جسم کے ساتھ ہی لگا تھا کہ یکدم گینڈے کی آنکھوں میں حیوانیت چمکنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ ختم ہوگئی اور اس کے مضبوط بازو اٹھے اور انھوں نے نھو کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ دم بھر میں نھو کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی ٹانگیں زمین سے اٹھ گئیں اور سر یوں پیچھے کو گر گیا جیسے روح جسم سے نکل چکی ہے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر گینڈے نے دانت نکال دیے۔ قریب تھا کہ وہ ایک جھٹکا اَور دے کر نھو کا کام تمام کر دے کہ حسّے نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا، ''کیا کر رہا ہے گینڈے پہلوان! یہ تو استاد نھو ہے، تیری سگائی نہیں ہے۔ چھوڑ دے پہلوان، مر جائے گا۔'' اور پھر گینڈے کے ہاتھ جوڑے اور سب نے مل کر منتیں کرنا شروع کر دیں۔

گینڈے نے زور سے ''ہی ہی'' کرنا شروع کیا اور اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ نھو کی جان میں جان تو آئی مگر اس کی ایک مونچھ کچھ نیچی ہوگئی۔ سانس بہتر لینے کے لیے اس نے دو گھونٹ شراب اَور پی لی اور اس منظر پر ہر ایک نے قہقہہ لگا کر بات آئی گئی کرنے کی کوشش کی۔ فیکا پہلے ہی گھونٹ سے دنیا اَور رنگ میں دیکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنے استاد کی مونچھ گرتے دیکھی تو ایک سلاخ اٹھالی اور ایک انگلی سے نھو کی مونچھ اٹھا کر نیچے سلاخ دینے لگا کہ اس کے سہارے مونچھ کھڑی ہو جائے۔ گینڈے کو یہ بات بہت پسند آئی اور خوش ہو کر اس نے فیکے سے کہا، ''تجھ کو برفی کھلاؤں گا۔ یہ مچھلی کھا۔''

''واہ واہ گینڈے پہلوان، کیا مچھلی لائے ہو!'' نوردین میونسپلٹی کے لالٹین جلانے والے نے کہا اور ایک بڑا سا گھونٹ پی کر مچھلی کھانے لگا۔ جوں جوں شراب انھیں چڑھنے لگی، یہ گینڈے کے گُن اَور گانے لگے۔

''پہلوان کو سگائی بھی پہلوان چاہیے،'' نتھو نے کہا۔

''پہلوان ہی تو ہے!'' حسّے نے کہا اور گینڈے کی رال ٹپکنے لگی۔

''استاد نتھو! تم نے اُس دن دیکھا ہوتا جب تینوں یہ جوان کنواری لڑکیاں حنیف پہلوان کی، گینڈے پہلوان کی تعریف کر رہی تھیں۔ 'مگدر ہے مگدر!' یوں کہہ رہی تھیں،'' حسّے نے بتایا۔

''سچ مچ یہ کہا تھا؟ تیری جان کی قسم، سچ مچ کہنا، یہ کہا تھا کہ مگدر ہے مگدر؟'' نتھو نے پوچھا۔

گینڈا خوب ہنسا۔

''تو یہ ہے شرط مگدر ہونے کی، گینڈے پہلوان!'' نتھو نے کہا۔

''اور حنیف پہلوان کی بیوی نے تو اسے حلوہ کھلا کر شگون بھی پورا کر دیا تھا،'' رلدو نے کہا۔

''سچ مچ حلوہ کھلا کر شگون پورا کر دیا تھا؟ تیری جان کی قسم، سچ مچ کہنا!'' نتھو بچھا جاتا تھا اور خوشی کے مارے یوں ہل رہا تھا جیسے بچے سبق پڑھتے ہلتے ہیں۔

''اور نہیں تو کیا! گینڈے پہلوان سے پوچھ لو۔ کیوں پہلوان، نہیں؟'' حسّے نے زور دیا۔

گینڈا اور زور سے ہنسا۔

''تو پھر تو اب وہ لڑکی تیری ہو گئی، گینڈے پہلوان،'' نور دین لالٹین جلانے والے نے کہا۔

''ہوگئی، تیری جان کی قسم، ہوگئی۔ یہی تو ہونے کی شرط ہے،'' نھو نے کہا۔

''مگدر کہا تھا اس نے، مگدر؟'' نوردین نے پوچھا۔

''ہاں مگدر!'' حسّے نے بتایا۔

''تو چلو اس کو بتائیں کہ گینڈے پہلوان کو مگدر کیسے کہتے ہیں،'' نوردین میونسپلٹی کی لالٹین جلانے والے نے غصے سے کہا۔

''تو چلو چلو! تیری جان کی قسم، چلو،'' نھو نے کہا اور اٹھا۔

''بارات بنا کر چلو،'' حسّے نے کہا۔

''بارات بنا کر چلو۔ ہاں! حلوہ کھلایا تھا نا اس کی ماں نے؟'' نوردین نے پھر پوچھا۔

''ہاں، حلوہ کھلایا تھا،'' نھو نے ڈولتے ہوئے کہا۔

''تو چلو پھر، اپنی سگائی کو لے آؤ، بارات بنا کر چلو،'' نوردین نے کہا اور ڈگمگاتے ہوئے چلا۔

''بارات بنا کر چلو گے تو دھیلے کون پھینکے گا؟'' سائیں بھولے کے بالکے شمّے نے پوچھا۔

''میں! ہی ہی ہی...'' گینڈے نے ہنستے ہوئے کہا اور ڈولتا ہوا اٹھا۔ اس نے الماری سے تمام ریزگاری نکالی جو نعل میں لگی تھی اور حنیف پہلوان کے تھیلے میں ڈال کر چلا۔

''دھیلے کون لائے گا؟'' فیکے نے پوچھا۔

''میں!'' گینڈے نے کہا اور نکل گیا۔

''واہ واہ! واہ واہ! تو آج گینڈے پہلوان کی دعوت ہو گئی۔''

گینڈا چاہ میراں والی سڑک سے ایک بُنیاری کی دکان سے سینکڑوں دھیلے اور پیسے بھنوا کر تھیلے میں ڈال لایا اور آتے ہی کہا، ''چلو!''

سب ایک ساتھ اٹھے کہ ''چلو!'' اور چلتے چلتے بوتلوں میں جو تھوڑی بہت رہ گئی تھی وہ سب نے انڈیل لی اور خالی بوتلوں کو ٹھوکریں مار کر اپنا اپنا باجہ اٹھایا۔

نوردین نے اپنی سیڑھی، تیل کا ٹین اور لالٹین اٹھالی اور سب باہر آ گئے۔

''کدھر ہے حنیف پہلوان کا مکان؟'' نوردین نے ایسے پوچھا جیسے کوئی قلعہ فتح کرنے والا ہو۔ سب نے ایک ساتھ بتایا کہ ''اُدھر۔''

''مال روڈ سے چلو،'' نتھو نے کہا اور چلّایا، ''بینڈ فال اِن۔'' وہ خود ڈگمگایا اور سڑک کے درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بینڈ باجے والے قطار میں کھڑا ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو پکڑ پکڑ کر اس کی جگہ اس کو بتا رہے تھے مگر خود اپنی جگہ ڈھونڈ نہیں پاتے تھے۔ ذرا اور ہوا لگی تو نوردین بھی کندھے پر سیڑھی کا توازن پوری طرح قابو میں نہ رکھ سکا اور یوں گھوما کہ اس کی سیڑھی کی لپیٹ میں سارے کا سارا بینڈ باجہ آ گیا اور زمین پر اوندھے منھ آ رہا۔ قریب تھا کہ بلوہ ہو جائے اور سب ایک دوسرے کو پیٹنے لگیں مگر گینڈے نے ایک مٹھی دھیلوں کی بھر کر ہوا میں اچھال دی۔ کچھ اس کی چھنچھناہٹ سے اور کچھ اس جلوس کے شور سے، بی بی کے احاطے اور کھوئی میراں والی سڑک سے درجنوں بچے بھی جمع ہو گئے اور دھیلے لُوٹنے لگے۔ فیکے اور شمے نے بھی دھیلے

اٹھائے۔ کچھ کتے بھی آ گئے اور زور زور سے بھونکنے لگے۔ اس پر نھتو کو خیال آیا کہ انتظام ٹھیک نہیں۔ وہ پھر چلّایا، ''بینڈ فال ان!'' سب پھر کھڑے ہو گئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور شمے نے ایک زوردار سُر ٹرمپٹ پر بجائی۔ نھتو نے کلارنٹ کی تمام سُریں بجا ڈالیں۔ ڈگڈگی بھی بجنے لگی اور کچھ دیر میں بارات بالکل تیار ہو گئی۔ ادھر بی بی کے احاطے سے ماسٹر عبدالغفور اور دِینا بھی جھانکے۔ دینے نے زور سے آواز دی اور پوچھا، ''بارات کدھر جا رہی ہے؟''

''حنیف پہلوان کی لڑکی لانے، گینڈے پہلوان کی سگائی لانے،'' نوردین نے کہا اور سیڑھی کا توازن درست کرتے ہوئے لالٹین لے کر آگے آگے چلنے لگا۔ اس کے پیچھے باقی باجے والے چلے۔ بڑی خاموشی سے دینا احاطے سے نکل کر اس کے پچھواڑے کہیں بھاگ گیا مگر اس کی کسی نے پروا نہیں کی۔

چاندنی رات میں گینڈے پہلوان کی بارات ایک ڈگمگاتے، ڈولتے، گرتے پڑتے جلوس کی صورت میں چلی۔ آگے آگے نوردین لالٹین اٹھائے اپنے نشے میں نعرے لگا رہا تھا، ''گینڈا پہلوان، زندہ باد!'' اس کے پیچھے نھتو کلارنٹ بجاتا فوجیوں کی طرح چلنے کی کوشش میں تھا۔ وہ اپنے پاؤں ہر بار اٹھا اٹھا کر اتنے زور سے مارتا کہ ہر بار گرتے گرتے بچتا۔ اس کے بینڈ باجے والے سب مزے میں باجہ بجا رہے تھے۔ کوئی دائیں چلا جا رہا ہے کوئی بائیں، کوئی اِس سے ٹکراتا ہے کوئی اُس سے۔ گینڈا ان کی مرکزی شخصیت تھا۔ گلے میں موتیا کے بے شمار ہار پہنے، کندھے پر حنیف پہلوان کا تھیلا رکھے، صف میں اکیلا چل رہا تھا اور اس کے پیچھے درجنوں بچے اور اس علاقے کے تمام کتے بھی

جمع ہو گئے اور پیچھے پیچھے بھونکتے ہوئے چلے گئے۔ یہ جلوس چند قدم چلا تو نور دین زور سے چلّایا، ''ہالٹ!'' جلوس رک گیا، بینڈ بجتا رہا۔ گینڈے پہلوان نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر ڈھیلے نکال کر اپنے اوپر اچھال دیے۔ سب بچے ان پر پل پڑے اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے، دھکے دیتے، ڈھیلے چننے لگے۔ کتے زور زور سے بھونکنے لگے اور پھر نور دین چلّایا، ''کوئِک مارچ!'' جلوس آگے بڑھا۔ اسی طرح رکتے چلتے، چوک تک پہنچتے پہنچتے، گینڈے کی بارات میں سو سے اوپر نفری ہو گئی جس میں زیادہ کتے تھے۔ اُدھر چوک میں رفیع پان والے اور نورے دودھ والے کی دکان پر خلقت جمع ہو گئی تھی اور کوٹھوں پر عورتیں بھی آ گئی تھیں جو دور سے بینڈ باجے کی آواز سن کر اس عجیب و غریب بارات کو آتا دیکھنے کے اشتیاق میں تھیں۔ اتنے ناظرین اور سامعین دیکھ کر نتھو للکارا اور بینڈ باجے نے ایسا زوردار نغمہ شروع کیا جو کتوں کے بھونکنے سے مل کر قیامت کا سماں پیدا کرنے لگا۔ اِدھر گینڈے پہلوان نے جب حنیف کے کوٹھے پر تین دلہنیں اور ان کی ماں دیکھی تو بڑے دھڑلے سے مٹھی پر مٹھی بھر کر ڈھیلے اچھالنا شروع کیے۔ ناظرین اور سامعین بھی اس لُوٹ میں شامل ہو گئے۔ کتے اَور زور زور سے بھونکنے لگے اور بارات کی رونق خوب بڑھ گئی۔ اتنے میں سب کو محسوس ہوا کہ کتے بارات کو چھوڑ کر دائیں بائیں جا رہے ہیں اور بہت جوش و خروش کے ساتھ بھونک رہے ہیں۔ نور دین نے نگاہ جو اٹھائی تو کیا دیکھتا ہے کہ بیسیوں جوان ہاتھوں میں ڈنڈے لیے چاروں طرف سے بھاگے آ رہے ہیں۔ انھیں دیکھ کر وہ چلّایا، ''ارے بھاگو، دوڑو، دوڑو! بھاگو!'' اور اپنی سیڑھی اور مٹی کے تیل کا ٹین پھینک کر اس نے لالٹین اچھال کر کتوں کے ہجوم کے درمیان

پھینک دی اور خود سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ لالٹین کا گرنا تھا کہ اس کا شیشہ پھٹا اور تیل کے بھتے ٹین کو آگ لگ گئی۔ اس سے وہ شعلہ اٹھا کہ سارا چوک جگمگا اٹھا۔ اوپر سے لاٹھیوں والے جوان آ پہنچے۔ یہ تھے صمدو، حافظ، ڈینا اور معراج تندور والا، اور ان کے ہمراہ وہ پہلوان تھے جو دوسری بستیوں سے اکھاڑے میں آیا کرتے تھے اور وہ پہلوان بھی جو آئندہ آنے والے تھے۔ انھوں نے دوست دیکھا نہ دشمن اور وہ ہاتھ دکھانے شروع کیے کہ اِدھر ایک گرا اور اُدھر دوسرا چلّایا اور تیسرا بھاگا اور چوتھا اُچھلا۔ کتے اَور زور زور سے بھونکنے لگے اور حملہ آوروں پر بھی ایسے ہی لپکنے لگے جیسے باراتیوں پر۔ اُدھر کسی نے ایک اینٹ اٹھا کر رفیع پان والے کی دکان میں مار دی۔ اس سے سوڈے کی بوتلیں ایسے دھماکے سے پھٹیں کہ جیسے بم چل گیا ہو۔ رفیع تو خیر پہلے ہی بھاگ چکا تھا، نورے نے دکان بند کر لی تھی، رانجھا اچھل کر اپنی دکان میں چلا گیا تھا اور پٹ بند کیے دروازوں میں سے جھانک رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ گینڈے کی پگڑی یوں اچھلی ہے جیسے کوئی مداری رسّے کو ہوا میں معلّق کرنے کا تماشا کر رہا ہو۔ بچے بھاگے، کتے بھونکے، ڈھول پھٹ گیا۔ شاں معلوم نہیں کدھر گیا۔ دیکھتے دیکھتے چوک خالی ہو گیا۔ باراتی بھی بھاگ گئے اور تماشائی بھی بھاگ گئے۔ دکانیں بند، بچے غائب، حتیٰ کہ کتے تک دور جا جا کر بھونکنے لگے۔

چوک کے عین درمیان گینڈا پہلوان پھٹے ہوئے ڈھول میں ایک ہاتھ دیے، دوسرے میں ڈھیلوں والا تھیلا مضبوطی سے پکڑے، چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اس کی ناک سے خون کی ایک لکیر مہر جبین کے احاطے کی طرف جا رہی تھی اور اس کی پگڑی بل

کھاتی ایک گڑھے میں لٹکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف درجنوں پہلوان دِینے کی قیادت میں کھڑے یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔

18

نور پور کی زندگی میں کوئی ہنگامہ بپا ہو جائے، کوئی ایسا واقعہ بھی ہو جائے جس سے ساری بستی کی بنیادیں بل جائیں، یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کا اثر ایک لمحہ یا بہت سے بہت ایک دن سے زیادہ رہے۔ چوک والوں کا راسخ عقیدہ تھا کہ کوئی زخم ہو، بھر جاتا ہے، کوئی سانحہ ہو، ٹل جاتا ہے، کوئی حقیقت ہو، بھلائی جا سکتی ہے۔ قدرت نے انھیں ایسا ذہن دیا تھا جو ہر رات ڈھل کر صبح کو کورا ہو جاتا تھا اور اس طرح یہاں ہر بار پوری زندگی شدید ترین زلزلے کے گزرتے ہی فی الفور معمول پر آ جاتی تھی۔

جس نے اُس رات گینڈے پہلوان کی بارات نہیں دیکھی تھی اسے اگلے روز احساس تک نہیں ہو سکتا تھا کہ چوک میں ایسا شدید بلوہ ہوا تھا۔ اسے اگلی صبح یہی نظر آتا کہ رفیع پان والے کی دکان میں کچھ بوتلیں ٹوٹی ہوئی پائی گئی ہیں، سڑک پر کچھ نشان سے پڑ گئے ہیں اور پرانی جوتیاں، دھجیاں وغیرہ بکھری ہیں، اور بس۔ ورنہ چوک والے، نورے دودھ والے اور رفیع پان والے کی دکان کے سامنے تھڑے پر حسبِ دستور چوسر کی بازی لگائے بیٹھے تھے، حقہ چل رہا تھا، ایک ہنگامے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ کچھ لوگ دودھ والی ریڑھیوں سے شہر جانے کی تیاری میں تھے۔ کوئی رفیع کے ٹھیلے میں گھوڑا جوت رہا تھا۔ اکھاڑا پھر سے شروع کرنے کی تیاری میں سائیں بھولا اپنی کوٹھڑی

کو سفیدی کر رہا تھا۔ ماسٹر عبدالغفور کا سکول گرمیوں کی تعطیل کے بعد پھر سے کھل گیا تھا اور بچے ہنستے کھیلتے وہاں چلے جا رہے تھے۔ مکان ڈھونڈنے والے رفیع کی دکان سے پتا پوچھتے تھے اور نئے مکان بنانے والے گھوم پھر کر 'ٹکڑہ جات اراضی برائے رہائشی مکان ہائے' دیکھ رہے تھے اور ہر چیز اپنے معمول پر آ گئی تھی۔

چندروز کے بعد جب امینہ کی بارات گئی اور اس کے ماموں کا بیٹا گھوڑے پر سوار اسے اپنے گاؤں لے گیا تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی کہتا بھی آخر کیا! ہاں، اس بستی میں اگر کسی کی آنکھیں اور کان ہوتے تو وہ صرف اتنا ضرور دیکھتا اور اتنا ضرور سنتا کہ گینڈا پہلوان دو چار دن چوک میں نظر نہیں آیا، اور جب آیا تو اگر رفیع پان والے نے اسے شہر سے سودا لا دینے کو کہا، یا رانجھے حجام نے حمام میں پانی بھرنے کو کہا، یا نورے نے دودھ کی کڑاہی مانجھنے پر آمادہ کرنا چاہا، تو اسے 'گینڈا پہلوان' نہیں بلکہ 'اوئے گینڈے' کہہ کر پکارا، مگر گینڈا حسبِ دستور خدمتِ خلق کے لیے حاضر اور تیار پایا گیا۔

❊❊

حمید شیخ (پورا نام عبدالحمید شیخ) سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور، کے ایڈیٹر رہے لیکن لاہور کے بارے میں اپنے ہفتہ وار کالم کی بدولت زیادہ معروف ہوئے جو وہ پاکستان ٹائمز کے لیے کئی برس، 28 مئی 1971 کو وفات پانے تک لکھتے رہے۔ اردو فکشن کے میدان میں حمید شیخ کی قصہ گوئی کی زبردست صلاحیت کا اظہار صرف اس مختصر ناول گینڈا پہلوان کی صورت میں ہوا جسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ مصنف کے پیش لفظ اور فیض احمد فیض کے تعارف سے معلوم ہوگا، گینڈا پہلوان ناولوں کے ایک سلسلے کا پہلا حصہ تھا جسے لکھنے کا حمید شیخ نے منصوبہ بنایا تھا اور جس کا مجموعی عنوان جلوس طے کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اس سلسلے کا اگلا کوئی ناول نہ لکھا جا سکا۔ یہ ناول بھی 1961 میں شائع ہونے کے بعد تقریباً مکمل طور پر نظرانداز ہو گیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن چھپنا تو درکنار، اس کا نام تک اردو فکشن کے کسی تذکرے میں نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم پڑھنے والے اس کے وجود سے واقف ہیں۔ اپنے قصے کے کرداروں کی زندگی اور ان کے گرد و پیش کے پُرمزاح بیان میں حمید شیخ نے اتنی فنکارانہ خلاقی سے کام لیا ہے کہ اس میں ایک علامتی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ اگر 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں اس قسم کے تخلیقی تجربوں کو مناسب توجہ اور پذیرائی حاصل ہوتی تو اردو فکشن شاید آگے چل کر سپاٹ اور اکتا دینے والی 'حقیقت نگاری' اور بے جان اور مضحکہ خیز 'علامت نگاری' کے رجحانات سے بچ سکتا تھا جنھوں نے ایک عرصے تک اس کی راہ کھوٹی کی۔

ISBN: 978-969-648-067-9

Rs.280

سرورق پینٹنگ: انور سعید